اسرار و رموز

پر ایک نظر

پروفیسر محمد عثمان

اسرار و رموز

پر

ایک نظر

پروفیسر محمد عثمان

ناشر

اقبال اکادمی۔ لاہور

طبع دوم سنہ ۱۹۷۷ء

ناشر اقبال اکادمی، لاہور

مطبع دوم فالکن پرنٹنگ پریس لاہور

مشمولات :

اسرار و رموز پر ایک نظر

از: ——— پروفیسر محمد عثمان

دیباچہ

علامہ اقبال نے اسرار و رموز میں اپنے نظریۂ خودی کو جس دلسوزی، فنکارانہ دلآویزی کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کی جزئیات میں جو مربوط معنویت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں نے چاہا کہ ان دو عظیم مثنویوں کے مطالعہ سے اقبال کے فکر و فن کی خوبیوں کا جو اندازہ مجھے ہوا ہے اس کو ملک کے عام تعلیم یافتہ طبقے اور بالخصوص کالجوں کے طلبہ و طالبات تک پہنچاؤں اور انہیں اس لطف و فیض میں شریک کروں جو ان منظوم شاہکاروں کی بدولت مجھے حاصل ہوا۔

لیکن اس کوشش میں لطف سے زیادہ فیض کا پہلو میرے پیشِ نظر رہا۔ قوموں کی تعمیر میں صحت مند افکار کو بڑا دخل ہے۔ ہم بحیثیتِ قوم جس اسلوبِ زندگی کے علمبردار اور جس اندازِ ترقی کے آرزومند ہیں، اسکے حصول میں سب سے زیادہ مدد ہمیں اقبال سے مل سکتی ہے۔ کیونکہ جدید دور میں اسلام کی غایت اور اس کے موقف و منہاج کو ان سے بڑھ کر کسی شخص نے نہیں سمجھا۔

دو باتوں کی صراحت یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ نظریۂ خودی فکرِ اقبال کا سب سے اہم اور مہتم بالشان حصہ ہے جس کی توضیح و تشریح اقبال کی ان کتابوں میں بھی ملتی ہے جو اسرارِ خودی (۱۹۱۴) اور رموزِ بےخودی (۱۹۱۸) کے بعد شائع ہوئیں۔ لیکن بعد کی تفصیلات جس اجمال پر مبنی ہیں اسے اقبال نے یک جا کر کے اسرار و رموز میں ہی پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ دو

کتابیں نظریہ خودی کے سمجھنے سمجھانے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ رموز میں اقبال نے اسلامی قومیت کے بارے میں جو تصورات پیش کئے، وہی تصورات اور دلائل بعد میں تحریک پاکستان کی بنیاد ٹھہرے۔ انہی کے زور پر خود اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الہ آباد والے مشہور خطبۂ صدارت میں تقسیمِ ہند کی پیشین گوئی کی اور انہی کی بدولت مارچ ۱۹۴۰ء برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اپنی جدوجہدِ آزادی میں کامیاب ہوئے۔ لہٰذا اسرار و رموز کا مطالعہ ہمارے لئے محض ایک علمی مطالعہ نہیں ہمارے لئے ان کتابوں کی اہمیت ذاتی اور قومی ہے۔

محمد عثمان

کیمبل پور۔ ۱۴ مئی ۶۱ء

حصّہ اوّل

(فرد)

باب ۱

خودی کی حقیقت

'اسرار' سے پہلے

خودی کی عالمانہ تشریح اور فلسفیانہ توضیح خواہ کچھ ہی ہو، اس کا سیدھا سادہ مفہوم خودداری اور خود اعتمادی ہے اور یہ وہ خیال ہے جو 'اسرار' سے پہلے ہمیں کئی نظموں میں ملتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم 'شمع و شاعر' کو لیجیے جو ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ اس کے ایک بند میں یہ خیال بڑے بلیغ انداز سے بیان ہوا ہے کہ انسان (اور اس اعتبار سے مسلمان) اگر احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہو اور اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے تو اس کے اندر ترقی کرنے اور بڑھ کر ایک بے پناہ قوت بن جانے کے غیر محدود امکانات پوشیدہ ہیں۔ ضرورت فقط اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ہیچ مقدار سمجھنا چھوڑ دیں اور دوسروں کا احسان مند اور دستِ نگر بن کر رہنے کی بجائے اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں اور خود اپنی قوتوں سے کام لیں۔ یہ اشعار 'اسرارِ خودی' کے پیشرو اور نقیب کہلانے کے مستحق ہیں:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے — راہ تو، رہرو بھی تو، رہبر بھی تو، منزل بھی تو

کا پتا جب دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا	ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو
دیکھ! آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی	قیس تو، لیلیٰ بھی تو، صحرا بھی تو، محمل بھی تو
وائے نادانی! کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا	مے بھی تو، مینا بھی تو، ساقی بھی تو، محفل بھی تو

اسی طرح قیامِ انگلستان کے زمانے (۱۹۰۵ - ۱۹۰۸) کی ایک نظم "پیامِ عشق" میں یہ خیال اس انداز میں ملتا ہے کہ ترقی و کمال حکومت و ثروت پر موقوف نہیں۔ یہ دولت ہر انسان کے سینے میں موجود ہے۔ جو شخص بھی محنت کرے گا اور اپنے ممکنات کو اُبھارے گا اُسے پا لے گا:

نہیں ہے وابستہ زیرِ گردوں کمال شانِ سکندری سے
تمام ساماں ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا*

انگلستان جانے سے پہلے اقبال کے سرمایۂ سخن میں "تصویرِ درد" سب سے طویل اور موثر نظم تھی جو ۱۹۰۲ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعض اشعار میں ہمیں نظریۂ خودی کے اوّلین آثار ملتے ہیں۔ یہاں اقبال پہلی بار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان اپنی تکمیل کے لئے خارج کا محتاج نہیں۔ وہ خود اپنا مرکز و محور ہے اور اس ڈھیلے رنگ و بو کی معنویت اس کے وجود سے وابستہ ہے:-

نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی	میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں نہ پیمانہ	میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

---

* اسی نظم میں ہمیں مندرجہ ذیل شعر بھی ملتا ہے:

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا	جہاں کا فرضِ قدیم ہے تو ادا مثالِ نماز ہو جا

یہ شعر اس بنا پر یہاں لائق یاد ہے کہ "پیکارِ زندگی" کا خیال نظریۂ خودی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اس پسِ منظر کے ساتھ اب ہم 'اسرار' میں پیش کئے گئے افکار کا مطالعہ کرتے ہیں

خودی کیا ہے؟

انسانی فکر کے دوسرے اعلےٰ اور نازک تصورات کی طرح خودی کی تعریف کرنا بھی مشکل ہے۔ آج نفسیات کی اصطلاح میں شخصیت کا جو مفہوم ہے خودی اس کے بہت قریب ہے۔ انسانی زندگی مادّی جسم اور ذہن و قلب (پرانی زبان میں 'روح') کی غیر مادّی قوتوں کے امتزاج کا نام ہے۔ تاریخ میں بیسیوں دَور ایسے آئے ہیں۔ جب قوموں نے مادّی جسم کی صحت و لذّت کو زندگی کا ماحصل قرار دیا۔ بدن کو مضبوط و توانا یا خوبصورت و سڈول بنانے پر ان کی ساری توجہ اور توانائی صرف ہوتی رہی۔ دوسری طرف کچھ ایسی قومیں بھی اسی کرۂ ارض پر اُبھری ہیں۔ جنہوں نے مادّی جسم کو سرے سے قابلِ اعتنا نہ سمجھا اور روح اور آتما کی ترقی و بالیدگی کے لئے ہر قسم کی عبادت و ریاضت کو مقصودِ نگاہ بنائے رکھا۔ اقبال نہ صرف جسم کے قائل تھے اور نہ محض روح کے۔ وہ پوری انسانی زندگی کا نشوو ارتقا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے 'جسمانی'، 'اخلاقی'، 'روحانی' قسم کی مروجہ اصطلاحوں کو اپنانے سے گریز کیا۔ کہ ان کے استعمال سے ذہن ان کے پامال اور انسانی زندگی کی اکائی میں تفریق ڈالنے والے معانی کی طرف منتقل ہو جاتے۔ اس کی بجائے انہوں نے ایک ایسا لفظ۔ خودی۔ اختیار کیا جو ان کے نزدیک حیاتِ انسانی کی 'مجموعی اصل' کو ظاہر کرتا ہے

اقبال اس لفظ یا اصطلاح سے جو کچھ سمجھتے اور سمجھانا چاہتے تھے اسے آسان لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے: قدرت ہر شخص کے اندر جسم و ذہن اور قلب و نظر کی کچھ صلاحیتیں، استعدادیں اور قابلیتیں ودیعت کرتی ہے۔ یہ صلاحیتیں ہمارے اندر سوئی ہوئی، چھپی ہوئی، ناپختہ اور خام ہوتی ہیں اور ابتداً ہم ان سے ناآشنا اور ناواقف محض

ہوتے ہیں۔ عقلمت کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنی ان صلاحیتوں کی تلاش و جستجو میں نکلیں، ان کا پتہ لگائیں اور ان سے آشنائی اور آگاہی پیدا کر کے انہیں پردۂ خفا سے معرضِ شہود میں لائیں اور اس طرح ان کی دگر یا اپنی، ترقی وارتقاء کا سامان کریں *۔ یہ صلاحیتیں اور استعدادیں جو کروڑوں اربوں انسانوں میں بھی کسی دو میں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ انہی کی مجموعی ترکیب سے ہر شخص کی 'ذات' 'ایغو' یا خودی تشکیل پاتی ہے اور اپنی جگہ پر لاثانی و منفرد ہوتی ہے۔ جس شخص کی صلاحیتیں غیر ترقی یافتہ اور غیر ارتقاپذیر رہ گئیں اس کی خودی گویا خوابیدہ و خام ہے۔ اور جس نے ان صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ان کے نشوونما کی خاطر جان جوکھوں میں ڈالی اس نے خودی اور اس اعتبار سے زندگی کا راز پالیا۔ اور وہ اس قوت و شوکت کا اہل بن گیا جو نسلِ آدم کا اصل حق ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ خودی کو پانا اور اس کی نشوونما کرنا گویا اپنی شخصیت کو پانا

---

* کلامِ اقبال سے خود اقبال کی 'تلاشِ ذات' اور 'حصولِ ذات' کی اس مہم کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے کہا تھا:

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے — کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

(بانگِ درا: ۵۲)

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو — آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

(بانگِ درا: ۱۱۱)

اور تیس بتیس برس کے بعد وہ کہہ سکے:

ہی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں — بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا

(بالِ جبریل: ۸۵)

اور اس کی نشو و نما کرتا ہے۔

ممکن ہے خودی کی یہ سیدھی سادی تعریف و تعبیر ان لوگوں کے لئے قابلِ قبول نہ ہو جو اپنے طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ اقبال کا تصورِ خودی بھی سمجھنے سمجھانے کے اعتبار سے اتنا ہی پیچیدہ اور دقیق ہے جس قدر آئن شٹائن کا نظریۂ اضافیت یا برگسان کا نظریۂ زماں۔ یہ خیال غلط فہمی پر محمول ہے۔ لیکن اس کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ اقبال نے اردو یا فارسی نظم و نثر میں خودی کی ہیئت و حقیقت سے کسی ایک جگہ باقاعدہ اور تفصیلی گفتگو نہیں کی۔ شعر خواہ اس کا کہنے والا کتنا ہی قادر الکلام ہو، جہاں تک خیال کی مدلل وضاحت کا تعلق ہے نثر کا بدل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ 'اسرار' کے پہلے باب میں جو چند اشعار خودی کی تعریف میں لکھے گئے ہیں اُن سے بات نہیں بنتی۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے اقبال نے مثنوی مذکور کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ ایک دیباچہ شائع کیا تھا۔ یہ دیباچہ اگرچہ بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ لیکن کچھ اپنے اختصار کی وجہ سے اور کچھ اندازِ بیان کے باعث یہ بھی اپنا مقصد پورا نہ کر سکا* اور نظریہ خودی کی کوئی عام فہم تعبیر معرضِ اظہار میں نہ آئی۔ خودی کی تعریف کرتے ہوئے وہ اس دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شئے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا 'انا' یا 'میں' جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر ہے لیکن اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب

---

* لہٰذا دوسرے ایڈیشن سے اس کو کتاب سے حذف کر دینا پڑا۔

نہیں وسکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر، اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے۔"

ظاہر ہے کہ خودی کی یہ تعریف ہمیں اسے 'وحدتِ وجدانی'، 'شعور کا روشن نقطہ' 'فطرتِ انسانی کی منتشر کیفیتوں کی شیرازہ بند' 'مشاہدات کی خالق' اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر، ایک 'پُراسرار شے' بتایا گیا ہے عام قاری کی سمجھ میں بھلا کیونکر آ سکتی تھی، اور وہ اپنے ذہن میں خودی کا کوئی واضح تصور کیسے قائم کر سکتا تھا اسے محض حسنِ اتفاق سمجھنا چاہئے کہ جب پروفیسر نکلسن نے 'اسرار' کا انگریزی ترجمہ تیار کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور اس کے بعض موضوعات کی وضاحت چاہی تو اقبال کے قلم سے بزبانِ انگریزی فلسفہ خودی کی ایک ایسی سلیس، مربوط اور شگفتہ صراحت ضبطِ تحریر میں آئی جو اردو یا فارسی کے کلامِ نظم و نثر میں ہمیں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس میں انہوں نے خودی کی مطلوبہ صورت کے لئے شخصیت (PERSONALITY) کا قدرے واضح اور غیر مبہم لفظ کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں شخصیت انسان کی 'عزیز ترین متاع' ہے جو زندگی کے قوی اور شاید احساس دجسے وہ تناؤ کی حالت کہتے ہیں* کی بدولت ہاتھ آتی ہے۔ لہذا ہمارا سب سے مقدم فرض اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ تناؤ کی اس حالت کو ضعف نہ پہنچے اور زندگی کے احساس کی شدت کم نہ ہونے پائے۔ کیونکہ شخصیت کے

---

* STATE OF TENSION

قرار و دوام کا انحصار اسی شدتِ احساس اور تناؤ کی حالت پر ہے۔ جو چیز اس تناؤ کی حالت کو قائم رکھنے میں ممد و معاون ہوتی ہے ۔ وہ ہمیں ابدی اور غیر فانی بننے میں مدد دیتی ہے۔ پس شخصیت (PERSONALITY) کا اصول ہمارے لئے قدر کا معیار مہیا کرتا ہے۔ اس سے خیر و شر کا مسئلہ طے پا جاتا ہے۔ جو چیز شخصیت کی حفاظت کرتی ہے خیر ہے، جو اسکو ضعف پہنچاتی ہے شر ہے ۔ فن، مذہب اور اخلاق سب کو شخصیت ہی کے نقطۂ نظر سے جانچنا پرکھنا چاہیئے۔*

اقبال کا عام طالب علم بھی جانتا ہے کہ اپنے اردو اور فارسی کے کلام میں انہوں نے جگہ جگہ خودی کو 'عزیز ترین متاع' کہا ہے اور خودی کو 'قدر کا معیار' اور خیر و شر کی کسوٹی قرار دیا ہے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ جو چیز خودی کو تقویت پہنچاتی ہے خیر ہے اور جو اس کو کمزور کرتی ہے شر ہے ۔ اس بنا پر میں نے ذرا اوپر خودی کے لئے جو 'شخصیت' کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کی مدد سے خودی کی ایک عام فہم تعریف و تعبیر کی ہے قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس قدر حق بہ جانب ہے †

کشمکش حیات اور اس کی غائت

انسانی زندگی کے متعلق صدیوں پرانا اسلامی تصور یہ ہے کہ یہ دنیا مومن کے لئے ایک آزمائش، ایک امتحان گاہ ہے۔ مومن خدا کا سپاہی اور اس کا نمائندہ ہے تاکہ

---

* دیباچہ اسرار خودی (انگریزی ترجمہ از نکلسن، صفحہ ۱۲)

† اس مسئلے پر تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

○ یہاں اسلامی تصور سے مراد وہ تصور ہے جو حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسےٰؑ اور رسول کریمؐ تک تمام انبیائے کرام نے پیش کیا۔ بنیادی طور پر ان تمام حضرات کا اندازِ نظر ایک ہے۔

وہ شر کی طاقتوں کا مقابلہ کرے اور نیکی اور خدا پرستی کا چراغ روشن رکھے۔ دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب بھی اس حیاتِ ارضی کو انسان کے لئے کسی نہ کسی طرح کی کشمکش اور آزمائش ہی بتلاتے ہیں۔ جدید سائنس بھی جس کا قافلہ سالار چارلس ڈاروِن ہے اس خیال کی حامی ہے۔ وہ بھی زندگی کو ایک کشمکش، ایک مجادلہ قرار دیتی ہے۔ اس اعتبار سے بیسویں صدی کا کوئی قابلِ ذکر مفکر بھی اس خیال کی تائید کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اقبال نے بھی زندگی کو ایک "پیکار" ایک کشمکش قرار دیا ہے۔ مگر یہاں ان میں اور دوسرے مفکرین اور بعض پیشوایانِ مذاہب میں ایک فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاروِن کو لیجئے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک میدانِ کارزار ہے جسمیں فطرت اپنی تمام سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ جانداروں پر جھپٹتی ہے۔ جو ان حوادث کی تاب لا سکتا ہے بچ نکلتا ہے۔ جو کمزور اور ناتواں پایا جائے، موت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ اس خونیں جنگ سے فطرت کا مقصود زندگی کو قائم رکھنا اور اسے جادۂ سفر پر رواں دیکھنا ہے۔ بقائے حیات کے لئے انسان فطرت کا آلۂ کار ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی اور مقصد کا ذریعہ ہے۔ وہ منزل نہیں رہگذر ہے۔ اسی طرح مشرق کے بعض مذاہب اس کشمکش میں انسان کی شرکت کا مقصد "انسان" کو نہیں اسکی "نجات" کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کشمکش "شر" ہے اور انسان کی غایت "خود کچھ بننا" نہیں بلکہ زندگی سے مُکتی یا مکمل خلاصی حاصل کرنا ہے۔

ان تصورات کے مقابلہ میں اقبال یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ یہ کشمکش شر نہیں بلکہ خیر ہے[1] اور

---

[1] "زندگی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادہ یعنی فطرت ہے۔ لیکن فطرت "شر" نہیں۔ کیونکہ اس کے خلاف تصادم کی بدولت ہی زندگی (خودی) کے مخفی جوہر آشکار ہوتے ہیں۔"

دیباچۂ اسرار (انگریزی)، صفحہ: ۱۵

اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری خودی بیدار ہو اور ہماری ذات نشو و نما پائے۔ وہ فطرت کی ساری خوش آشامیوں کا مقصود انسان کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان سامانِ سفر نہیں خود منزل ہے۔ انسانی شخصیت کی تعمیر و تکمیل اس تمام عالمی کشمکش کی غائت ہے۔ جیسا کہ آپ اوپر دیکھ آئے ہیں۔ اس خیال کو انہوں نے بہت پہلے (۱۹۰۷ء کے قریب) یوں ادا کیا تھا ع

غرض ہے پیکارِ زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا

بیس پچیس سال بعد (بالِ جبریل مطبوعہ ۱۹۳۵ء) انہوں نے کہا :

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار ۔۔۔ کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

خودی اور نظامِ عالم

تمہید کے بعد "اسرار" کا پہلا باب یہی موضوع رکھتا ہے۔ اسمیں اقبال خاصے دقیق اور فلسفیانہ انداز میں ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیائے رنگ و بو، یہ عالمِ کون و فساد، خودی کی بدولت معرضِ وجود میں آیا اور خودی کی بدولت ہی ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ شش جہات میں ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے سب خودی کا کرشمہ اور اسکی قدرتوں کا اظہار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اقبال ذاتِ خداوندی کو ایک خودی کے طور پر پیش کر رہے ہیں، جس نے زندگی کی ترقی کے لئے فطرت میں تصادم و پیکار کا پُر حکمت قانون رائج کیا ہے۔

خودیِ مطلق کی خلاقانہ قدرتوں اور حکمتوں پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال مخلوق کی خودی کی طرف آتے ہیں اور یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ لاکھوں کروڑوں برس میں زندگی نے جو کچھ پایا اور حاصل کیا ہے سب کچھ خودی کے زور سے پایا اور حاصل کیا ہے۔ ماحول کی طاقتوں سے لڑ کر ان پر قابو پانا اور اس طرح اپنے ممکنات کو ابھارنا

اور اپنے تقاضوں کو پورا کرنا خودی کی فطرت ہے۔ خودی ترقی و تکمیل کی خاطر ہر قسم کے مجادلے کشاکش اور اسراف و سنگدلی کو بخوشی قبول کرتی ہے۔ تخریب و تاراج کا جو عنصر ہمیں فطرت میں ہر جگہ نظر آتا ہے یہ بظاہر سنگدلی اور اسراف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ جمالِ معنوی کی تکمیل کے لئے ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔ ایک عمدہ پھول کے لئے فطرت صد گلشن، ویران کرتی ہے۔ اور ایک نغمہ کی خاطر اسے نالہ وزاری کے سینکڑوں مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک آسمان کے لئے وہ یک سو چاند اور ایک حرفِ محرمانہ کی خاطر ایک سو قیل و قال پیدا کرتی ہے۔ اس اتلاف اور بے رحمی کا جواز یہ ہے کہ فطرت کو خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ وہ اس طرزِ عمل سے کامل اشیاء اور کامل افراد کو معرضِ وجود میں لانے کی سعی میں مصروف ہے:

عذرِ ایں اسراف و ایں سنگیں دلی خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی

آئینِ فطرت کی اس توضیح و توجیہہ کے بعد وہ نفسیاتِ خودی کا مزید تجزیہ کرتے ہیں۔ فطرت کے مقاصد کو خودی ہی پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہے۔ خودی کے اندر جو ذوقِ نمو ہے وہ اسے بے قرار اور مصروفِ عمل رکھتا ہے اور اسی بے قراری اور عمل کی بدولت زندگی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا زندگی کا انحصار خودی پر ہے۔ حیات کی اصل اور روحِ رواں خودی ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں:

چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است پس بہ قدرِ استواری زندگی است

جب زندگی کی ساری ہمہ ہمی اور گرم بازاری خودی پر موقوف ہے تو پھر جس قدر خودی میں استواری ہوگی زندگی میں اسی نسبت سے استحکام اور استقلال کی شان پائی جائے گی۔ یہاں وہ اپنے خیال کی تائید میں کچھ واقعات، کچھ مشاہدات بطورِ تمثیل پیش کرتے ہیں کہتے ہیں گوہر کی حقیقت پر غور کرو۔ کیا اصلاً یہ بارش کا ایک قطرہ نہیں؟ پھر کیا

تعجب ہے کہ اس کے ساتھ کے بے شمار قطرے یا تو خاک میں جذب ہو کر مٹ گئے یا سمندر کی وسعتوں میں فنا ہو گئے۔ مگر یہ قطرہ گوہر کی خوبی و جمال اور قدر و قیمت کو پہنچ گیا؟ اقبال اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس قطرے نے خودی کا سبق یاد کر لیا تھا اور اس راز کا محرم ہو گیا تھا کہ استحکام میں زندگی ہے لہٰذا وہ گوہر بن کر رہا:

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند　　　　ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند

اسی طرح جب سبزہ اپنے اندر اگنے اور بڑھنے کی طاقت پیدا کر لیتا ہے تو گلشن کا سینہ چیر کر نکل آتا ہے اور اس کے راستے میں زمین کی سختی حائل نہیں ہو سکتی:

سبزہ چوں تابِ دمید از خویش یافت　　　　ہمتِ او سینۂ گلشن شگافت

گوہر اور سبزۂ دمیدہ کے مقابلے میں شراب اور جام کی حیثیت پر غور کرو۔ شراب ضعفِ خودی کے باعث سرے سے کوئی "پیکر" ہی نہیں رکھتی اور اپنی ہستی کے لئے مینا و ساغر کی محتاج ہے۔ جامِ مے اگرچہ پیکر رکھتا ہے۔ لیکن اس کی خودی کیونکہ پختہ نہیں اس لئے اپنی گردش کے لئے وہ دستِ غیر کا منت کش ہے۔

آخر میں وہ اپنے نظریے سے ایک اور منطقی نتیجہ اخذ کرتے ہیں: جس کی خودی جس قدر محکم اور پختہ ہوگی وہ اسی نسبت سے اپنے سے کمتر خودی والی اشیاء کی تعظیم و تکریم کا مرجع قرار پائے گا۔ زمین اپنی ذات میں چاند کے مقابلے میں زیادہ محکم ہے لہٰذا چاند اس کے گرد طواف کرنے پر مجبور ہے۔ سورج چونکہ زمین سے بھی محکم تر ہے۔ اسلئے زمین سورج کے گرد گھومتی اور اس کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے:

چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است　　　　ماہ پابندِ طوافِ پیہم است

ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است　　　　پس زمیں مسحورِ چشمِ خاور است

اس طرح "اسرارِ خودی" کے پہلے باب* میں اقبال یہ خیال قاری کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی زورِ خودی سے عبارت ہے۔ لہٰذا ہماری خودی جس قدر محکم ہوگی ہم اسی قدر زندگی کی فضیلتوں کے حقدار ٹھہریں گے۔

---

* باب کا عنوان جاننے کے قابل ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے: "نظامِ عالم کی اصل خودی ہے اور افراد کی زندگی و بقا خودی کے استحکام پر موقوف ہے۔"

باب ۲
تخلیقِ مقاصد اور عشق و محبت

تخلیقِ مقاصد:

اب سوال یہ ہے کہ جس جوہرِ خودی پر زندگی کا انحصار ہے وہ کیونکر استحکام اور مستحکم ہو سکتا ہے۔ خودی کی بیداری میں اقبال "مقاصد" کو سب سے مقدم رکھتے ہیں۔ "اسرار" کے دوسرے باب کا عنوان ہے: "خودی تخلیقِ مقاصد سے زندہ و بیدار ہوتی ہے" اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ زندگی میں حرکت اور رفعت کسی اونچے مقصد کی لگن سے، کسی نصب العین کی گرمی و حرارت سے پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے سینے اونچے مقاصد کی روشنی و حرارت سے خالی ہوتے ہیں ان کی زندگی بھی ہر قسم کی فضیلت و برتری سے عاری ہوتی ہے۔ جو شخص جس قدر اونچا مطمحِ نظر رکھتا ہو گا، جس قدر اعلےٰ تمناؤں اور آرزوؤں کو دل میں جگہ دے گا۔ اُسی نسبت سے اس کی زندگی میں توانائی، اور قوت زیادہ آئے گی۔ ہم میں جوشِ عمل، قوتِ مقابلہ اور ایثار و قربانی کا جذبہ دراصل مقاصد کی لگن سے پیدا ہوتا ہے۔ مقصد کی لگن ہم کو خطرات سے بے نیاز اور مشکلات سے بے پرواہ کر دیتی ہے۔ اور اسی طرح زندگی کا کارواں "ذوقِ طلب" اور "سوزِ آرزو" کی بدولت آگے بڑھتا ہے*۔

زندگی میں مقاصد کی اہمیت کو اقبال نے بہت پہلے جان لیا تھا۔ انگلستان سے طلبۂ علی گڑھ

---

* اقبال نے مقصد اور نصب العین کے معنوں میں حسبِ ذیل الفاظ و تراکیب استعمال کی ہیں: مدعا، جستجو، آرزو، تمنا، سوزِ آرزو، داغِ آرزو، چراغِ آرزو، ذوقِ طلب وغیرہ۔

کے نام جو نظم ۱۹۰۷ء میں بطور پیام بھیجی تھی، اس کا ایک شعر یہ ہے:

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو
گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے (بانگِ درا : ۱۱۹)

یعنی انسان کی جیتی جاگتی ہستی اور جامِ مے کی بے جان ذات میں اصل فرق تمناؤں اور آرزوؤں کا ہے۔ جامِ مے دستِ غیر کا محتاج ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے اپنے دل میں کوئی آرزو پیدا اور کوئی تمنا بے تاب نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس انسان کی برتری کا راز یہ ہے کہ وہ اپنی گردش کا آپ محرک اور خالق ہوتا ہے۔ اس کی تگ و دو اس کی باطنی تحریک یعنی کچھ پا لینے کچھ کر دکھانے کی آرزو کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس معیار پر پورا نہیں اترتا اور اس کا سینہ ذوقِ طلب اور سوزِ آرزو سے محروم ہے تو پھر اس میں اور بے جان جامِ مے میں کیا فرق رہا۔ ایسی صورت میں ہمیشہ کی زندگی بھی اس کے لئے موت کے برابر ہے۔ شعر کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی حقیقی عظمت و امتیاز کا راز ذوقِ طلب میں ہے۔

اقبال کی نظر میں انسان کی برتری کا یہ سبب ــ انسان کا صاحبِ آرزو ہونا ــ نہایت بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ایک دعائیہ نظم (۱۹۱۱ء) میں وہ مسلمان قوم کے لئے دنیوی جاہ و جلال یا اخروی خیر و فلاح مانگنے کے بجائے اس کے لئے 'زندہ تمنا' کی دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کی یہ دعا قبول ہو گئی تو دنیا و آخرت کی باقی تمام نعمتیں اس کے قدرتی نتائج کے طور پر ان کو لازماً حاصل ہو جائیں گی۔ چنانچہ وہ اپنی دعا کا یوں آغاز کرتے ہیں:

یارب! دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے

(بانگِ درا : ۲۳۷)

اسی شعر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک 'زندہ تمنا' انسانی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے۔ تمنا قلب کو گرماتی اور روح کو تڑپاتی ہے اور یہی گرمی اور تڑپ ہماری تمام کامرانیوں کی ضمانت ہے۔*

'اسرار' کے دوسرے باب میں وہ بڑے مؤثر اور دلنشیں انداز میں اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہیں: آرزو کاروانِ حیات کے لئے 'درا' کا حکم رکھتی ہے۔ زندگی کی اصل آرزو میں پوشیدہ ہے۔ آرزو عالمِ رنگ و بو کی جان ہے کہ اس کے بغیر دنیا کی ہماہمی اور ترقی کا خاتمہ ہو جائے۔ سینوں کے اندر دل اسی کی بدولت رقص کرتے اور روشن و تابناک ہوتے ہیں۔ تمنا فہم و ادراک کی رہنما ہے اور اپنے طلسماتی اثر سے پیکرِ خاکی کو ماہ و انجم کی رفعت بخشتی ہے:

زندگانی را بقا از مدعاست — کاروانش را درا از مدعاست
زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسئ ادراک را

یہاں تک وہ شاعری سے زیادہ کام لیتے ہیں اور علمی استدلال سے کم۔ لیکن آگے چل کر وہ مقصد اور آرزو کے حق میں خالص علمی دلائل لاتے ہیں۔ مشرق و مغرب کے جو مفکر اور فلسفی نظریۂ ارتقاء کے کسی نہ کسی رنگ میں حامی ہیں۔ ضروری ہے کہ وہ مسلکِ ارتقاء کی کوئی معقول توجیہہ پیش کریں۔ زندگی کیونکر اور کس اصول کی بدولت نہایت ادنیٰ درجے سے ترقی

---

* اسی 'دعا' کا ایک اور شعر ہے:

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر — خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے

کرتے کرتے جہاں نگر اور خود نگر انسان تک پہنچی؟ ڈارون نے اسی کے لئے طبعی انتخاب اور اتفاقات کا نظریہ پیش کیا۔ اسکے خیال میں فطرت زندگی کو آگے بڑھانے کی خاطر ایک طرف تو زندہ رہنے کے قابل جانداروں کا انتخاب کر کے بقیہ کو فنا کے گھاٹ اتارتی رہی ہے اور دوسری طرف ناگہانی واقعات و اتفاقات نے اس کا ہاتھ بٹایا ہے۔ برگسان نے اس کے لئے قوتِ حیات (ELAN VITAL) کا تصور پیش کیا۔ اقبال ولیم میکڈوگل کی طرح ارتقاءِ حیات کے پیچھے آرزوؤں اور تمناؤں کا دستِ قوت کارفرما دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقصد کی لگن اور حصولِ آرزو کی تڑپ دلوں کو بے قرار رکھتی ہے اور دلوں کی یہ بے قراری اپنی خواہش کے مطابق خارج میں واقعات کو، حالات اور اسباب پیدا کرتی ہے۔ اس طرح گویا خارج میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ ایک طرح سے آرزوؤں کے نہاں خانہ سے ابھرتا اور تمناؤں کے باطنی سرچشمے سے پھوٹتا ہے۔

اقبال ہم سے پوچھتے ہیں کہ ہماری آنکھوں کی حقیقت کیا ہے؟ ہمیں دیکھنے کی طاقت کیونکر حاصل ہوئی؟ اور خود جواب دیتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں دیکھ سکنے کی جو شدید آرزو پیدا ہوئی، یہ آنکھیں اس کا نتیجہ ہیں۔ ہماری 'دیدۂ بیدار' ہماری 'لذتِ دیدار' کی بدولت ہے۔ دوسرے لفظوں میں لذتِ دیدار ہی نے دیدۂ بیدار کی صورت اختیار کر لی ہے:

چیست اصلِ دیدۂ بیدارِ ما؟ بست صورت لذتِ دیدارِ ما

اس طرح کبک کو پاؤں 'شوخیٔ رفتار' کی بدولت اور بلبل کو منقار 'سعیٔ نوا' کی بدولت میسر آئے۔ ان کے دلوں میں جن چیزوں کی آرزو بے تاب ہوئی قانونِ قدرت کے مطابق ان کو ویسی ہی چیزیں دستیاب ہو گئیں:

کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت بلبل از سعیٔ نوا منقار یافت

دلیل رفتہ رفتہ آگے بڑھتی ہے۔ عقل وادراک کی نعمت ہم کو کیسے ہاتھ آئی! یہ بھی آرزو کے بطن سے پیدا ہوئی ہے:

عقلِ ندرت کوش و گردوں تاز چیست؟ ہیچ میدانی کہ ایں اعجاز چیست؟

زندگی سرمایہ دار از آرزو ست عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست!

اسی طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تنظیم و تہذیب کے لئے ہم نے جو متعدد ضابطے وضع کئے ہیں، جو قانون اور قاعدے بنائے ہیں، جو عمرانی اور معاشرتی علوم و فنون ایجاد کئے ہیں۔ یہ سب کس کا اعجاز ہے؟ ہمارے دلوں میں مہذب، باضابطہ اور ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کی جو آرزو تھی یہ سب اسی کے رہینِ منت ہیں:

چیست نظمِ قوم و آئین و رسوم چیست رازِ تازگیہائے علوم

آرزوے کو بزورِ خود شکست سر ز دل بیروں زد و صورت پبست

الغرض ترقی کے سارے سامان اور ارتقاء کے تمام اسباب آرزو اور تمنا ہی کی بدولت معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ہمارے جسم کے مختلف اعضاء اور حواس بھی اسی سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔ گرفت اور حرکت کی آرزو نے ہاتھ (اور پاؤں)، کھانے اور کاٹنے کی لذت نے دانت دیکھنے اور سننے کی تمنا نے آنکھ اور کان، اور سوچنے سمجھنے اور یاد رکھنے کی خواہش نے دماغ اور فکر و حافظہ پیدا کئے اور ان سب آلات و وسائل سے زندگی نے اپنی بقا و حفاظت کا کام لیا:

دست و دندان و دماغ و چشم و گوش فکر و تخییل و شعور و یاد و ہوش

زندگی مرکب چو در جنگاہ یافت بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت*

---

* نکلسن کو اپنے خط میں لکھتے ہیں: "زندگی جذب و تسخیر کی بڑھتی ہوئی رَو ہے۔ یہ اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو جذب و تسخیر سے دور کر دیتی ہے۔ اسکی حقیقت کا راز اس (باقی بر صفحہ آئندہ)

علم وفن بھی زندگی کے خادموں اور چند متگناوقں میں شامل ہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق و ایجاد کا سہرا بھی زندگی کو قوی اور با اختیار بنانے کی تمنا کے سر ہے:

علم وفن از پیش خیزانِ حیات　　　علم وفن از خانہ زادانِ حیات

ان دلائل و شواہد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی میں تمنا اور آرزو کس قدر بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور کیوں اقبال خودی کی بیداری میں تخلیقِ مقاصد کو سب سے مقدم رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم وہی کچھ بنتے اور حاصل کرتے ہیں جسکے بننے اور حاصل کرنے کی تمنا ہمارے دِلوں میں موجزن ہوتی ہے۔ اگر آرزوئیں گھٹیا اور تمنائیں پست ہیں تو ہم گھٹیا اور پست انسان بن کر رہ جائیں گے۔ اگر آرزوئیں اعلیٰ اور مقاصد بلند ہیں۔ تو انجامِ کار ہمارا کردار اُسی نسبت سے اعلےٰ اور بلند اوصاف کا حامل ہوگا۔ زندگی روزِ ازل سے اس اصول پر کاربند ہے اور ابد تک یہی دستور کارفرما رہے گا۔ لہذا جو شخص اپنی ذات کی ترقی اور اپنی خودی کی تعمیر کا خواہاں ہے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ شرطِ اوّل کے طور پر پہلے اپنے آپ کو کسی نہایت بلند مقصد سے آشنا کرے۔ زیرِ نظر باب کے آخر میں اقبال ہمیں صبح کی طرح تابندہ اور آسمان سے بالاتر کسی مقصد کے نشے سے خود کو سرشار کرنے کی پُرزور تلقین کرتے ہیں:

اے زِ رازِ زندگی بیگانہ، خیز　　　از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

مقصدے مثلِ سحر تابندۂ　　　ماسوی را آتشِ سوزندۂ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) میں ہے کہ یہ آرزوؤں اور نصب العینوں کی مسلسل تخلیق کرتی رہتی ہے۔ اور اپنی بقا اور توسیع کے لئے اس نے بعض آلات مثلاً حواس اور دماغ وغیرہ ایجاد کئے یا یوں کہئے کہ اپنے اندر سے ابھارے ہیں۔ یہ آلات و وسائل اس کو رکاوٹوں پر قابو پانے میں مدد دیتے ہیں۔"
دیباچہ اسرار (انگریزی) صفحہ ۱۵

مقصدے از آسماں بالاترے   دلربائے دلستانے دلبرے

باب کا آخری شعر اپنے بلیغ اندازِ بیان اور اثر آفرینی کے اعتبار سے اس موضوع پر حرفِ آخر معلوم ہوتا ہے۔ اسمیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تخلیقِ مقاصد کے باعث ہی تو زندہ ہیں اور ہماری زندگی میں جس قدر چمک اور تابناکی ہے وہ آرزوؤں کی مرہونِ منت ہی تو ہے۔ (اگر ہم مقاصد کی تخلیق اور ان کے حصول کی جدوجہد ترک کردیں تو ہم پر مُردنی چھا جائے اور ہماری خودی پر موت طاری ہو جائے۔):

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم*

عشق ومحبت

تخلیقِ مقاصد سے خودی زندگی پاتی ہے تو عشق ومحبت کا جذبہ اسکو استحکام بخشتا ہے۔ انسانی زندگی میں اس جذبے کو کتنا اونچا اور کتنا اہم مقام حاصل ہے۔ اقبال اس حقیقت کو بیان کرتے نہیں تھکتے۔ انہوں نے اپنی شاعری اور فکر کے ہر دور میں محبت کے موضوع پر لکھا۔ مگر اس موضوع میں ان کے لئے کچھ ایسی کشش، کچھ ایسا جذب موجود تھا کہ ہزار تکرار کے باوجود نہ ان کی طبیعت سیر ہوئی اور نہ اشعار کا جادو کم ہوا۔ اقبال

---

* 'رموزِ بیخودی' میں بھی اس موضوع پر چند اشعار بڑے زوردار ہیں جن کا مطالعہ ہم کتاب کے دوسرے حصے میں کریں گے۔ البتہ یہاں بالِ جبریل کا ایک شعر ذکر کے قابل ہے۔ اسمیں اقبال انسانی زندگی کو اس قدر گراں مایہ قرار دیتے ہیں کہ اسکے بدلے میں شانِ خداوندی کا قبول کرنا ان کے نزدیک گھاٹے کا سودا ہے اور جو چیز حیاتِ انسانی کو اس قدر گراں مایہ بنا رہی ہے وہ یہی آرزو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیتِ سوز و گداز ہے:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی   مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

تاریخِ عالم کے ان معدودے چند مفکرین اور فلاسفر میں سے ہیں جو زندگی کی تکمیل میں محبت کو غالباً سب سے اونچا اور سب سے بنیادی مقام دیتے ہیں۔

'اسرار' کے تیسرے باب میں وہ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ خودی جو آرزوؤں اور تمناؤں کی آغوش میں آنکھ کھولتی ہے، عشق و محبت کی بدولت پختہ و جوان ہوتی ہے۔ محبت، سے خودی ابدی اور لازوال بنتی ہے۔ محبت ہی اسکے جوہرِ جنس کو آشکارا اور اس کے ممکنات کو روشن کرتی ہے۔ جب خودی عشق و محبت کی آگ میں جلتی ہے، تو وہ سورج کی طرح نور کا منبع بن جاتی ہے۔ عشق تیغ و خنجر سے نہیں ڈرتا کیونکہ اسکی اصل عالمِ آب و خاک سے ماوراء کسی اور عالم سے تعلق رکھتی ہے۔ محبت کی نگاہ میں وہ جادو ہے کہ اسکی تاثیر سے پتھر بھی شق ہوجائیں اس لئے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اپنا معشوق تلاش کریں اور فریضۂ عاشقی انجام دیں۔

یہاں اقبال عشق کے مفہوم کو ابہام کے دھندلکوں سے بچا کر اسکی ایک واضح اور ٹھوس صورت پیش کرتے ہیں۔ محبت کے ہزاروں مقام اور ہزاروں رنگ ہیں مگر تکمیلِ خودی میں محبت کا جو عنصر درکار ہے وہ کسی انسانِ کامل کی محبت ہے تاکہ کردار اور سیرت اسکے رنگ میں رنگ سکے، اسکے سانچے میں ڈھل جائے۔ مثال کے طور پر اقبال مولانا رومی اور شمس تبریز کی محبت کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنے کتابی علم و فن پر ناز کرنے والے معلم جلال الدین کو شمس کی محبت نے عارفِ رومی اور 'مولوی معنوی' بنا ڈالا۔

لیکن اقبال رومی و شمس کی محبت پر بھی ایک سے زیادہ شعر نہیں کہتے اور بہت جلد ہماری توجہ محبت کے اس نصب العین کی طرف مبذول کر دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ہر مسلمان کے دل میں ہمیشہ موجود ہے مگر ہماری غفلت اور بدقسمتی کے باعث ہماری آنکھ سے اوجھل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمہارے دل میں ایک معشوق

موجود ہے۔ اگر تمہاری آنکھ کام کرتی ہو تو آؤ میں تمہیں دکھاؤں:

ہست معشوقے نہاں اندر دلت   چشم اگر داری بیا بنمائمت

یہ معشوق کیسا ہے! اس کے چاہنے والے حسینانِ عالم سے زیادہ خوبصورت، دلنواز اور محبوب ادا ہوتے ہیں۔ اس کی محبت سے دل توانائی پاتا ہے اور خاک ہمدوشِ ثریا ہو جاتی ہے اور پھر بیان کرتے ہیں:

در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است   آبروئے ما زِ نامِ مصطفےٰ است

رسولِ اکرمؐ سے محبت محض جذباتی یا مذہبی نوعیت نہیں رکھتی۔ یہ محبت شخصی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نصب العین، ایک اسوۂ حسنہ، انسانی سیرت کی ایک معراج سے محبت ہے تاکہ ہم میں مطلوبہ اوصاف ابھر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے چالیس کے قریب جو اشعار اس باب میں رسولِ کریمؐ کی نسبت لکھے ہیں۔ ان میں 'نعت' کا انداز کم اور 'سیرت' کا پہلو نمایاں ہے۔ ان اشعار میں انہوں نے آنحضرتؐ کے اسوہ حسنہ کے جن پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، ذیل میں ہم ان کو مختصر طور پر درج کرتے ہیں:

۱۔ آپؐ بوریا نشین تھے مگر امت میں وہ شوکتِ خیال اور قوتِ عمل پیدا کی کہ قیصر و کسریٰ کے تاج اُن کے قدموں میں آن پڑے۔

۲۔ غارِ حرا میں آپؐ کی خلوت گزینی کی بدولت عالمِ انسانی کو ایک نئی جمعیت، ایک نیا طرزِ زندگی اور نیا آئینِ سلطنت نصیب ہوا۔

۳۔ آپؐ کی آنکھیں راتوں کو بے خواب و بے آرام رہیں تاکہ امت تختِ خسروی پر آرام کرے۔

۴۔ جلال کا یہ عالم کہ میدانِ جنگ میں آپؐ کی تلوار سے لوہا بھی موم ہو جاتا۔ جمال کی یہ

کیفیت کہ دوطلِ نمازآنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔

۵۔ آپؐ نے دُنیا کو ایک ایسا ذہن بخشا جس نے فرسودہ تمدن اور ملوکانہ نظامِ سلطنت کا خاتمہ کر ڈالا۔

۶۔ آپؐ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا اور دین و دنیا کی تفریق مٹا ڈالی۔

۷۔ آپؐ کی نگاہ میں امیر اور غریب، آقا اور غلام برابر تھے۔ آپؐ نے اپنے غلاموں کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

۸۔ آپ کا لُطف و کرم بھی رحمت تھا اور قہر و جلال بھی رحمت، لطف دوستوں کے حق میں اور قہر دشمنوں کے حق میں رحمت ثابت ہُوا۔ آپؐ کی ذات وہ ہے جس نے دشمنوں پر بھی عفو و کرم کا دروازہ کھول دیا اور اہلِ مکہ کو (فتحِ مکہ کے موقع پر) لا تثریب کا جانفزا پیغام سُنایا*۔

۹۔ آپؐ کی آتشِ محبت نے رنگ، نسل، وطن اور قومیت کے تمام امتیازات کو جلا کر خاکستر کر دیا اور نوعِ انسانی کی وحدت کو استوار کیا۔

۱۰۔ یہ آپؐ کا فیضان ہے کہ ہم مسلمان خواہ حجازی ہوں یا چینی یا ایرانی قیدِ وطن سے قطعی بیگانہ اس طرح ایک ہیں جیسے دونوں آنکھوں کی نظر ایک ہوتی ہے۔ ہم ایک ہی صبحِ خنداں کی (قطرہ ہائے) شبنم ہیں۔

ایسے انسانِ کامل کی محبت خودی کی قوتوں کو بیدار اور اس کے ممکنات کو روشن کرنے کا

---

* اس شعر کے ضمن میں حاشیہ پر (دیباچہِ اردو) لکھتے ہیں: "اگرچہ کفارِ عرب نے نبی کریمؐ کو بہت ایذا دی تھی مگر فتحِ مکہ کے بعد جبکہ فاتح کو انتقام کا حق اور قوت حاصل تھی، حضور علیہ السلام نے لا تثریب علیکم (یعنی تمہارے لئے کوئی تعزیر نہیں) فرما کر سب کو معاف فرمایا۔"

سب سے موثر ذریعہ ہے۔[1] اس محبت کا رنگ کیا ہونا چاہیئے؟ اقبال اس کو 'تقلید' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان آنحضرتؐ کی تعلیمات اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ کی سختی کے ساتھ پیروی کریں۔ اس ضمن میں وہ بایزید بسطامیؒ کے عشقِ رسول پر ایک شعر لکھنے کے بعد حاشیہ میں خود اسکی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں: "حضرت بایزید بسطامیؒ نے خربوزہ کھانے سے محض اس بناء پر اجتناب کیا تھا کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ پھل کس طرح کھایا ہے۔ اسی کامل تقلید کا نام عشق ہے۔"

عشق: مقامِ شوکت و سطوت

ہر چند عشق کی متذکرہ بالا توضیح میں اقبال نے 'تقلید' پر زور دیا ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ عام انسانوں کی خودی کو کسی انسانِ کامل کی خودی کا ضمیمہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو انہوں نے 'اسرار' کے پانچویں باب میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں وہ اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ خودی جب عشق و محبت سے محکم ہوتی ہے تو اسکے اندر کائنات کی ظاہری اور مخفی قوتوں سے کام لینے اور ان کو مسخر کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں وہ بوعلی قلندرؒ کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کرتے ہیں: ایک روز حضرت بو علیؒ کا ایک مرید اپنے خیال میں محو بازار میں چلا جا رہا تھا کہ اُدھر سے حاکمِ شہر کی سواری نمودار ہوئی۔ مرید بیچارہ حاکموں کی تعظیم و تکریم کے آداب کیا جانتا تھا۔ چوبداروں اور غلاموں کی للکار پکار کے باوجود وہ اس راستے پر چلتا گیا اور تعظیماً اس سے الگ نہ ہوا۔ اس پر ایک چوبدار کو غصہ جو آیا اس نے مرید کے سر پر اپنی لاٹھی دے ماری۔ مرید کے لئے یہ حادثہ ناقابلِ فہم تھا۔ وہ زخمی ہو کر سیدھا بو علی قلندر

---

[1] کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے — بوسہ زن بر آستانِ کاملے

کی بارگاہ میں پہنچا اور اپنی مظلومیت کی فریاد کی۔ حضرت بو علی قلندر نے حاکم کے غرور جاہ اور انسانیت کی تذلیل کا جب یہ واقعہ سُنا تو اُن کا فقر جلال میں آگیا۔ فوراً دبیر کو طلب کیا اور بادشاہِ وقت کے نام خط لکھوایا۔ خط کا مضمون یہ تھا: یہ تحریر ایک فقیر کی طرف سے سلطان کے نام ہے۔ شہر کے حاکم نے میرے مرید کا سر پھوڑ دیا ہے اور اپنے لئے آگ کو دعوت دی ہے۔ اگر اسے قرار واقعی سزا دی گئی تو خیر ورنہ تمہاری سلطنت میں کسی اور کو بخش دوں گا*۔ جب یہ عتاب نامہ بادشاہِ دہلی (علاؤالدین خلجی) کے پاس پہنچا تو وہ اپنے غیر معمولی جاہ و جلال کے باوجود لرز اُٹھا۔ اور اس کا رنگ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح زرد پڑ گیا۔ اس نے فوراً حاکم کی طلبی کے احکام جاری کئے اور شیریں مقال امیر خسرو کو معذرت خواہی کے لئے بو علی قلندر کی خدمت میں پانی پت بھیجا۔ امیر خسرو نے قلندر کی بارگاہ میں حاضر ہو کر پہلے تو ایک پُرسوز غزل گائی اور جب حضرت قلندر نے خوشی کا اظہار فرمایا۔ تب بادشاہ کا معافی نامہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور خود بھی بہت کچھ عرض معروض کی، اور اس طرح بادشاہ کے لئے فقیر سے معافی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اقبال کے نزدیک جس شخص کی خودی تقلید و عشق کی کٹھن راہ سے گزر کر پختہ ہو جاتی ہے۔ اس کے تصرف و اختیار کی کوئی حد نہیں رہتی۔ ایسے فرد کا جذب و جلال تخت و تاج کو بھی لرزہ بر اندام کر دیتا ہے**۔

---

* باز گیر ایں عاملِ بد گوہرے ۔۔۔ ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے

** از محبت چوں خودی محکم شود ۔۔۔ قوتش فرماندہِ عالم شود

در خصوماتِ جہاں گردد حکم ۔۔۔ تابعِ فرمانِ او دارا و جم

باب ۳

سوال اور نفیٔ ذات

جس طرح تخلیقِ مقاصد اور عشق و محبت خودی کی بیداری اور استواری کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح دو چیزیں خودی کے ضعف اور کمزوری کا سبب بنتی ہیں۔ اوّل 'سوال' جس کا مطلب دوسروں کا محتاج، دستِ نگر اور زیرِ بارِ احسان ہونا ہے* - اور دوسری نفیٔ ذات جس کے معنی اپنے آپ کو ہیچ اور بے حیثیت سمجھنے اور ناسازگار حالات پر غالب آنے کی بجائے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کے ہیں۔ اقبال خودی کے لئے جس طرح مقدم الذکر دو چیزیں — آرزو اور محبت — کو ناگزیر خیال کرتے اور ان کی تعریف میں پُرجوش ہیں۔ اسی طرح وہ مؤخر الذکر رجحانات — سوال اور نفیٔ ذات — کی سخت مذمت

---

* نکلسن کو لکھتے ہیں: "ذاتی محنت کے بغیر جو کچھ بھی حاصل ہو وہ 'سوال' کی ذیل میں آتا ہے۔ ایک امیر آدمی کا بیٹا جو باپ کی کمائی ہوئی دولت کو ورثہ میں پاتا ہے۔ ایک سوالی مانگنے والا ہے۔ یہی حیثیت ہر اُس شخص کی ہے جو دوسروں کے خیالات سوچا دار اپناتا ہے۔ پس خودی کے استحکام کے لئے ہمیں جذبۂ محبت — جذب و عمل کی قوت — پیدا کرنا چاہیئے۔ اور سوال یعنی بے عملی کی ہر نوع سے بچنا چاہیئے۔" دیباچۂ اسرار انگریزی

کرتے اور ان کو نسلِ آدم کے حق میں مہلک قرار دیتے ہیں۔

سوال

دوسروں کے احسان سے بچنے اور خود اپنی ذات سے اپنی زندگی کا ساز و سامان پیدا کرنے پر فارسی اور اُردو کے دیگر شعراء نے بھی زور دیا ہے۔ مرزا غالب جب یہ کہتے ہیں:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

تو وہ دراصل (قدرے انتہا پسندی کے ساتھ) اسی خود اکتفائی اور بے منتِ غیر زندگی گزارنے کا درس دے رہے ہوتے ہیں۔ ایک اور شعر میں وہ احسان قبول نہ کرنے کا مشورہ ان الفاظ میں دیتے ہیں:

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

احسان اٹھانے سے فائدہ؟ جبکہ ایسا کرنے والا اپنے وجود کی معنویت ہی کھو بیٹھے! اس قسم کے دو دو چار چار شعر قریب قریب ہر نامور شاعر کے دیوان سے مل جائیں گے لیکن ان شعراء کے مقابلے میں اقبال کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے اس مسئلے کو محض ایک اخلاقی نکتہ کے طور پر نہیں، بلکہ اپنے نظریات اور نظامِ فکر کی ایک اہم کڑی کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال کے لئے یہ موضوع دوسروں کی طرح سرسری سے نصیحت و پند کا معاملہ نہیں بلکہ تعمیرِ آدمیت میں ایک مستقل اور بنیادی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔

'اسرار' کے چوتھے باب میں وہ ملتِ اسلامیہ کی موجودہ درماندگی اور بیچارگی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ قوم جو کبھی شیروں سے خراج وصول کرتی تھی کیا وجہ ہے کہ آج ہر قسم کی جرأت و حمیت سے عاری اور روباہ مزاجی سے ہمکنار نظر آتی ہے؟ اسکی وجہ ناداری اور حاجتمندی ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں نے ان وسائل سے قطع نظر کر لی جو

دنیوی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے ضروری تھے۔ اس کے نتیجہ میں ناداری اور افلاس نے انساں کو گھیر لیا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی بھی قوم کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔
حاجت مندی اور بلند خیالی ایک دوسرے کے رقیب ہیں، جو ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔
حاجت مندی دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے، ان سے مدد مانگنے اور ان کا سہارا لینے پر مجبور کرتی ہے۔ اس حاجتمندی میں عزتِ نفس اور اعتمادِ ذات کے احساسات فنا ہو جاتے ہیں اور اسکی خودی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے:

از سوال افلاس گردد خوار تر　　　از گدائی گدیہ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی　　　بے تجلی نخلِ سینائے خودی

ضربِ کلیم میں یہی خیال یوں ادا کیا ہے:

حاجت سے مجبور مردانِ آزاد　　　کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ

خودی کی حفاظت اور زندگی کی آبروئی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم افلاس اور ناداری کے باوجود حالات کے سامنے ہتھیار نہ ڈالیں اور دوسروں کا احسان قبول کرنے سے احتراز کریں۔ یہاں اقبال حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ آپؓ اونٹ پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ آپ کے ہاتھ سے تازیانہ زمین پر گر پڑا۔ اب ان کے سامنے دو راستے تھے۔ کسی دوسرے کو تازیانہ اٹھانے کے لئے کہتے یا سواری سے اتر کر خود اسے اٹھاتے۔ حضرت عمرؓ کی خوددار طبیعت نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اقبال اس واقعہ کی طرف توجہ دلا کر مشورہ دیتے ہیں:

خود فرود آ از شتر مثلِ عمرؓ　　　الحذر از منتِ غیر الحذر

یعنی حضرت عمرؓ کی طرح اونٹ سے خود اتر آؤ لیکن کسی کا احسان اٹھانے سے

حذر کرو۔ جو شخص کسی دوسرے کے دسترخوان سے فائدہ اٹھاتا ہے اسکی گردن احسان کے بوجھ سے جھکی رہتی ہے۔ ایسے شخص پر افسوس ہے کہ اس نے دوسروں کی 'برقِ لطف' سے اپنے آپ کو جلا ڈالا اور چند کوڑیوں کے عوض غیرت جیسی متاعِ بے بہا بیچ ڈالی۔ مگر وہ حوصلہ مند جوان جسکی غیرت تنگدستی میں اسکو اور زیادہ خوددار اور غیرت مند بنا دے لائق ہزار ستائش ہے۔ وہ صنوبر کی طرح سربلند اور معزز رہے گا۔ اسکی قسمت گو سو رہی ہے لیکن وہ خود بیدار ہے:

زیرِ گردوں آں جوانِ ارجمند   می رود مثلِ صنوبر ارجمند
در تہی دستی شود خوددار تر   بختِ او خوابید و اُو بیدار تر

اقبال کو اس قسم کی خودداری اور استغنا سے زندگی بھر دلچسپی رہی۔ وہ اس وصفِ انسانی کی اہمیت اور قدر و قیمت سے اپنی شاعری اور فکر کے اوّلین دور ہی میں آگاہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۴ء (تصویرِ درد) میں انہوں نے پہلی بار اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ہمیں 'حبابِ آبجو' سے درسِ استغنا حاصل کرنا چاہیئے کہ کس طرح وہ بہتی گنگا میں بھی اپنے 'ساغر' کو الٹا رکھ کر اپنی سیرچشمی اور غیر کے احسان سے گریز کا ثبوت دیتا ہے۔ کہتے ہیں:

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیئے مثلِ حبابِ آبجو رہنا*

'شمع و شاعر' (۱۹۱۱ء) میں وہ اس خیال کو پھر پیش کرتے ہیں:

---

* 'تصویرِ درد' کا ایک اور مصرعہ ملاحظہ ہو:

علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا!

تو اگر خوددار ہے منت کش ساقی نہ ہو
عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ رکھ

"اسرار" کے زیرِ نظر باب کے آخری شعر میں بھی انہوں نے اسی تمثیل سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ حباب کی طرح مردِ غیرت مند بنو۔ سمندر کے اندر رہ کر بھی اپنے ساغر کو نگوں رکھو، اور منتِ غیر سے اپنا دامن تر نہ ہونے دو:

چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

"اسرار" کے اس خیال کو بھی انھوں نے کئی بار دہرایا ہے کہ جو رزق اور مالی منفعت دوسروں کی بخشش و کرم کا نتیجہ ہو اس سے حوصلہ مندی اور جرأتِ فکر و عمل کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے خودی کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان ایسے رزق اور ایسی دولت و ثروت سے پرہیز کرے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرو فالِ محمود سے درگذر خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر (بالِ جبریل)

ہم تنگدستی کو گوارا کر لیں حتی کہ موت کو، لیکن دوسروں کی بخشی ہوئی تونگری اور امارت کو ہرگز قبول نہ کریں کیونکہ یہ ہمارے لطیف اور بلند احساسات کا خاتمہ کر دے گی۔ یہ ہے وہ خیال جو ذیل کے مشہور شعر میں ادا ہوا ہے:

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سطوت و اقتدار کی تمنا ہر انسان کی فطرت میں ہے لیکن مزہ جب ہے کہ ہم اسے ذاتی جدوجہد اور قابلیت کی بنا پر حاصل کریں۔ جو اقتدار دوسروں کے سہارے حاصل ہو اور اس بنا پر غیرت اور خودداری کی نفی پر قائم ہو وہ کسی صورت میں مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا:

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن　　خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

۱۹۱۹ء میں جب مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں اسلامیانِ ہند کا ایک وفد انگلستان گیا تاکہ خلافت کی برقراری و بحالی کے لئے حکومتِ برطانیہ کی امداد حاصل کرے تو اقبال کی طبیعِ خود دار پر یہ بات بہت ناگوار گزری۔ چنانچہ انہوں نے وہ مشہور قطعہ لکھا جس کی صحت و صداقت کا اقرار خود رئیسِ وفد نے بعد میں کیا* اس قطعہ میں یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد کہ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ حکومتیں اور سلطنتیں بزورِ قوت حاصل کی جاتی ہیں مانگی نہیں جاتیں، کہتے ہیں:

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی**

ان کے نزدیک زندگی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ ہم اپنی دنیا خود پیدا کریں۔ فطرت ہم کو جو کچھ دیتی ہے، ماحول سے ہم کو جو کچھ ملتا ہے، اس پر قانع اور مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ اس سے قطعِ نظر کر کے یا اس سے نبرد آزما ہو کر اپنے لئے ایک نئی دنیا کی تخلیق کریں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کُن فکاں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

---

* دیکھئے "اقبال کا سیاسی کارنامہ" از محمد احمد خاں۔

** خضرِ راہ (۱۹۲۲ء) میں بھی اس طرف اشارہ ہے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

بوریائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر! حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

وہی جہاں ہے ترا جسکو تو کرے پیدا
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

مختصر یہ کہ دوسروں کے طفیل اور ذاتی جدوجہد کے بغیر جو کچھ حاصل ہو وہ "سوال" ہے اور سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے لہذا اس سے حذر لازم ہے۔

نفیٔ خودی

خودی کے لیے "سوال" اور احتیاج سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ کسی فرد یا قوم کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے کہ قوت و طاقت، سطوت و حکومت اور جوشِ عمل زندگی کی اصل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اس کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ سخت کوشی کے مقابلے میں تن آسانی، اقتدار کے مقابلے میں مسکینی اور تونگری کے مقابلے میں افلاس بہتر اور افضل ہیں اور یہ تصور اس کے ذہن میں بیٹھ جائے کہ یہ حیاتِ انسانی موہوم اور یہ دنیائے رنگ و بو محض فریبِ نظر ہے اور اس کے حصول یا بہبود کے لئے کوشش کرنا اور جان جوکھوں میں ڈالنا قطعی بے سود اور لاحاصل شے ہے۔ اقبال کی تحقیق یہ ہے۔ کہ یہ نظریۂ حیات جس سے خودی کی نفی ہوتی ہے اور عمل کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ زندہ اور فعال قوموں کے خلاف کمزور اور محکوم قوموں کی ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ جب کمزور قوموں نے طاقتور اور جوشِ عمل سے سرشار قوموں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بے بس پایا تو اپنی بے بسی کا علاج اور حریف کی قوت کا جواب فقط اس صورت میں دیکھا کہ حریف کے دل و دماغ کو ایک زہرناک تصورِ حیات سے بھر دیا جائے تاکہ وہ دست و بازو جن کا مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت و طاقت نہیں، خود بخود شل ہو کر رہ جائیں۔ "اسرار" کے چھٹے باب میں اقبال نے ان حقائق و افکار کو ایک حکایت کے پیرایہ میں بڑی عمدگی سے بیان

کیا ہے۔ کہتے ہیں:

کسی چراگاہ میں کچھ بھیڑ بکریاں رہا کرتی تھیں۔ چراگاہ کیونکہ سرسبز تھی اور ہر طرف گھاس اور سبزہ لہلہاتا تھا۔ اس لئے بھیڑ بکریوں کا یہ گلہ بڑے اطمینان سے بڑھتا اور پھلتا رہا۔ مگر ایک مدت کے بعد ان کی قسمت نے پلٹا کھایا اور ایک رات جنگل کے شیروں نے چراگاہ پر دھاوا بول دیا۔ پھر کیا تھا۔ قوت اپنا مظاہرہ کرنے لگی اور چراگاہ بھیڑوں کے خون سے لالہ زار بن گئی۔ اس گلے میں ایک بھیڑ بڑی دانا، زیرک اور جہاں دیدہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ شیر چراگاہ پر قابض ہو گئے ہیں اور بھیڑ بکریاں ان کے سامنے قطعی بے بس اور عاجز ہیں تو اس کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس نے سوچنا شروع کیا کہ شیروں کے فولادی پنجوں سے بچ نکلنے کی آخر کیا تدبیر کارگر ہو سکتی ہے؟ ہفتوں کی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ بکریوں کی بزدل اور بے حوصلہ جماعت میں تو شیروں کی سی خو بو پیدا کرنا ناممکن ہے، البتہ شیروں میں بھیڑوں کا سا مزاج ابھارا جا سکتا ہے۔ اور ان کے اندر بزدلی اور بے حوصلگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس کا ذہن رسا تھا اور یوں بھی غلامی و محکومی میں جب جذبۂ انتقام پختہ ہو جائے تو عقل حیلہ گری اور فتنہ انگیزی میں تیز ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس نے ایک مکمل منصوبہ تیار کیا اور کچھ عرصے کے بعد اعلان کر دیا کہ وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے شیروں کے لئے پیغمبر اور رسول مقرر ہو کر آئی ہے اور ایک ایسا آئینِ حیات لائی ہے جس سے بے نور آنکھوں کو نور اور محروم مسرت دلوں کو مسرت میسر آئے گی۔ اس اعلانِ نبوت کے ساتھ اس نے طاقت کے حصول اور استعمال کے خلاف اپنے تصورات کی اشاعت شروع کر دی۔ اس نے کہا۔ اس دنیا میں جسے طاقت اور قوت حاصل ہے وہ دراصل بدبخت اور بے نصیب ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ۔

جو قوت کے مقابلے میں ضعیفی اور دولت کے مقابلے میں تنگدستی کو بہتر سمجھتے ہیں اور جو گوشت خوری کی بجائے گھاس پات پر گزران کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا نے جنت کمزوروں اور ضعیفوں کے لئے بنائی ہے اور جو لوگ یہاں صاحبِ قوت نظر آتے ہیں۔ ان کے لئے آئندہ کی زندگی بڑی دردناک ہوگی*۔ اگر تم سلامتی کے خواہشمند ہو تو اپنے آپ کو بے زور اور حقیر بنائے رکھو۔ کیونکہ قوت و سطوت قدرتاً عذاب و مصائب کو دعوت دیتی ہے تم جب تک ایک حقیر دانہ رہو گے تمہیں بجلی کا کوئی خوف نہیں۔ اگر خرمن بنو گے تو برق سوزاں تمہیں ضرور اپنی لپیٹ میں لے لے گی تم فقط ایک ذرہ بن کر رہو، صحرا بننے کی ہرگز تمنا نہ کرو کیونکہ ذرہ آفتاب سے منور ہوتا ہے مگر صحرا آندھیوں اور طوفانوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ تم بھیڑوں کو ذبح کرنے پر فخر کرتے ہو یہ تباہی اور ذلت کا راستہ ہے۔ اگر عزت چاہتے ہو تو "خود" کو ذبح کر دو اور اپنی ہستی کو مٹاؤ کیونکہ جبر و اقتدار زندگی کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتے ہیں اور اسمیں استحکام نام کو نہیں چھوڑتے۔ سبزہ کی طرف دیکھو وہ پامال ہے اس بنا پر بار بار ابھرتا ہے اور موت پر قابو پا لیتا ہے۔ عقلمند وہ ہے جو احساسِ ذات کو فنا کر دے اور دیوانہ وہ ہے جو اپنی ذات سے غافل نہ ہو۔ اگر عقلِ رسا چاہتے ہو تو اپنی آنکھیں، کان اور لب بند رکھو کہ ان کے استعمال سے حقیقی علم کی راہیں مسدود ہوتی ہیں**۔ یاد رکھو یہ دنیا اور اسکی مسرتیں ہیچ اور موہوم ہیں اور جو لوگ ان کے لئے تگ و دو کرتے ہیں وہ بالآخر نقصان اور گھاٹے میں رہیں گے۔

شیروں پر اس خواب آور تعلیم کا گہرا اثر ہوا۔ ایک مدت تک قوت و سطوت سے

---

* جنت از بہرِ ضعیفاں است و بس ۔۔۔ قوت از اسبابِ خسران است و بس

** چشم بند و گوش بند و لب بہ بند ۔۔۔ تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

کام لینے کے بعد ان میں تن آسانی اور آرام طلبی کا خیال ان پیدا ہو رہا تھا۔ جب اس نئی تعلیم سے ان کے کان مانوس اور دل متاثر ہونے لگے تو ان کی طبیعتیں سخت کوشی اور جفا طلبی سے بیزار ہو گئیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے شکار سے ہاتھ اٹھا لیا اور گھاس پات پر گزران کرنے لگے۔ اس تبدیلی سے ان کے مزاج اور اعصاب پر خوفناک اثر پڑا۔ دانتوں میں تیزی باقی نہ رہی۔ آنکھوں سے جو ہیبت و جلال کے شعلے برستے تھے وہ بجھ گئے۔ کوششِ کامل، اور جدوجہد کا جو ولولہ دلوں میں اٹھتا تھا وہ سرد پڑ گیا۔ آہنی پنجے بے زور ہو گئے۔ دلوں پر افسردگی چھا گئی اور بدن ہڈیوں کے پنجر نظر آنے لگے*۔ جب جسموں کی طاقت کم ہوئی تو جان کا خوف بڑھا اور ہمت و حمیت نے جواب دے دیا۔ ایسی صورت میں عزت و اقبال اور وقار و اقتدار کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے**۔ وہ شیر نر جن کی گونج گرج سے وادی و صحرا کے دل کانپتے تھے، اب بے ہمتی اور میل نے ان کی آواز کو بے اثر اور ان کے دست و بازو کو بے جان بنا ڈالا۔ الغرض یوں ایک انتقام پسند بھیڑ کی حیلہ گری اور فسوں کاری سے جیتے جاگتے شیر بھیڑوں کا گلہ بن کر رہ گئے۔

اس حکایت کا موضوع اقبال کے نظامِ فکر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نطشے اور بعض دوسرے مغربی مفکرین کی طرح وہ بھی ہر اس تحریک اور فلسفہ کے جانی دشمن ہیں جو انسانوں کے قوائے عمل کو مضمحل اور ان کے ارادوں کو کمزور اور بے جان بنا دے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث آئندہ باب میں کی جائے گی۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہو گا کہ

---

* پنجہ ہائے آہنی بے زور شد — مُردہ شد دلہا و تنہا گور شد

** دل بتدریج از میانِ سینہ رفت — جوہرِ آئینہ از آئینہ رفت

اقتدار و عزم و استقلال رفت — اعتبار و عزت و اقبال رفت

اقبال کے نزدیک وہ تصورات جو دنیا کو موہوم اور دنیوی جدوجہد کو بے سود ٹھہراتے ہیں۔ اور جن کی بدولت انسانوں میں مسکینی و دلگیری پیدا ہوتی ہے، خودی کے لئے انتہائی زہرناک ہیں۔

باب ۴
نظریۂ ادب

گذشتہ باب کے آخر میں مَیں نے کہا تھا کہ اقبال ہر اس تحریک اور فلسفہ کے دشمن ہیں جو انسانوں کی قوتِ عمل کو مضمحل اور ان کے ارادوں کو کمزور بنا دے۔ وہ اس خیال تک کیسے پہنچے؟ یہ سوال جس قدر اہم اور دلچسپ ہے اسی قدر مشکل بھی۔ بات یہ ہے کہ اقبال جب اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ پہنچے تو اُس زمانے میں یورپ اور بالخصوص جرمنی کی یونیورسٹیوں میں (جہاں اقبال بھی کچھ عرصہ ٹھہرے رہے) نطشے کے افکار کا بہت چرچا تھا اور نطشے کے ہاں یہ تصور بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس نے اقوامِ عالم کا جو تجزیہ اپنی کتابوں میں پیش کیا ہے اس میں اس بات پر خصوصی زور ملتا ہے کہ مذاہب اور نظام ہائے اخلاق دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو زندگی کو ہاں کہتے ہیں اور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو زندگی سے آنکھیں چراتے اور اس کے تقاضوں سے بھاگتے ہیں۔ نطشے کے نزدیک پہلی قسم کے مذاہب اور نظامہائے اخلاق نے انسانیت کو قوت بخشی ہے اور اس کی ترقی اور ارتقاء کا باعث ہوئے ہیں مگر دوسری قسم کے افکار نے اسے پست ہمت اور زوال پذیر بنایا ہے۔* اس لئے ان کی

---

* نطشے کے نزدیک عیسائیت دوسری قسم کے مذاہب میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اس مذہب اور اس کے تصورات پر شدید حملے کئے ہیں۔

مخالفت کرنا، ان کے فروغ کو روکنا اور انسانوں کے ذہن سے ان کے زہریلے اثرات کو مٹانا فلسفہ و شعر کے عظیم مقاصد میں داخل ہے۔

لیکن اپنے قیام یورپ کے دوران (۱۹۰۵ - ۱۹۰۸ء) میں اقبال نے فلسفۂ عجم پر جو مقالہ لکھا، اسکے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اس زمانے تک وہ اس خیال کے قائل ہو چکے تھے یا اسے کوئی اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے متذکرہ کتاب میں ایران کے متصوفانہ لٹریچر کا جائزہ لیا ہے مگر اس کے مضر حیات پہلوؤں کی جیسا کہ انہوں نے بعد میں کیا، کوئی نشاندہی نہیں کی۔

• ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ولائت سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد جب اُن کے مخصوص نظریات نے جنم لیا تو یہ خیال بھی اسی زمانے کی غور و فکر کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ خود تاریخِ اسلام کے ابتدائی اور بعد کے ادوار کا ناقدانہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ خیال ذہن میں اُبھر سکتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اور اس موقع پر مولانا حالیؔ کے اس بصیرت افروز تجزیہ کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے 'حیاتِ سعدی' (۱۸۸۱ء) میں فارسی شاعری اور بالخصوص حافظؔ شیرازی کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حافظ کی غزل ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے۔ عشقِ حقیقی کے ساتھ ہی عشقِ مجازی اور صورت پرستی اور کام جوئی کو بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مال و دولت، علم و ہنر، نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ، زہد و تقویٰ، غرضکہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و تدبیر، مآل اندیشی، تمکین و وقار، ننگ و ناموس، جاہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ مذمت کرتی ہے اور آوارگی، رسوائی، بدنامی

بادمستی، بے سروسامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی بدولت حاصل ہو تمام حالتوں سے بہتر ظاہر کرتی ہے .... اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو اکثر ان صفات سے موصوف پاتے ہیں جنکی اس مجموعۂ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی و حُسن پرستی ان کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف دولتمند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اسکا چسکا رکھتے ہیں اور نہ صرف نوجواں بلکہ معمر لوگ بھی اس کا دم بھرتے ہیں۔ فضول خرچی، ناعاقبت اندیشی، عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا، توکّل و قناعت کے دھوکے میں معاش کی کچھ فکر نہ کرنا، غیر قوموں کی ترقی کا ذکر سُن کر دُنیا و مافیہا کو ہیچ اور پوچ بتانا، عقلِ انسانی کو حقائقِ اشیاء کے ادراک سے عاجز جاننا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک دھوکا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیّتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیّتیں اسی شعر و غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کو ترقی دینے میں بہت کچھ مدد پہنچائی ہے۔"*

بہر حال خواہ اقبال مغربی افکار کی بدولت اس خیال تک پہنچے یا مولانا حالی جیسے پیشروؤں کی تحریروں سے انہیں کچھ مدد ملی یا یہ خیال ان کا طبع زاد تھا، کوئی صورت بھی

---

* حیاتِ سعدی (ایڈیشن دوم) صفحات ۱۷۸ - ۱۸۰۔

تھی، جو بات ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے "اسرار" کے ساتویں
باب میں ان اثرات کا جائزہ لیا جو یونانی فلسفہ اور ایرانی شاعری نے بہ حیثیتِ مجموعی مسلمانوں
کے اخلاق اور طبائع پر ڈالے اور بڑے زوردار الفاظ میں افلاطون کے فلسفے اور حافظ کی غزل
کی مذمت کی۔ اور ان دونوں کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا کہ ان کے زہریلے اثرات نے
مسلمانوں کے جوشِ عمل کو ٹھنڈا کر دیا اور ان کے ذہنوں میں چپکے ہی چپکے ایسے تصورات بکھیر
دیئے جنہوں نے بالآخر ان کو افسردہ دل، کم ہمت، ذلت پر قانع اور سہل انگار بنا ڈالا*

افلاطون

پہلے افلاطون (۴۲۷ ق م ۔ ۳۴۷ ق م) کو لیجئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یونان کے اس عظیم
فلسفی نے گذشتہ ڈھائی ہزار برس میں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو اپنے افکار و تصورات
سے مسخر کیا ہے اور ہر دور اور قریب قریب ہر مہذب قوم میں اس کے ماننے والے اور اس کی
عظمت کا دم بھرنے والے موجود رہے ہیں لیکن معتقدوں اور عقیدت مندوں کے اس ہجوم میں
جہاں تہاں کوئی نہ کوئی ایسا مفکر بھی نظر آجاتا ہے جس نے اس فلسفی کے افکار کی تردید میں
اپنا زورِ قلم صرف کیا ہو۔ مخالفت و تردید کا یہ سلسلہ خود افلاطون کے عظیم شاگرد ارسطو سے
شروع ہوا تھا اور اب تک جاری ہے۔ اس رجحان کا جدید ترین نمائندہ انگلستان کا نامور
فلسفی ادیب برٹرینڈ رسل ہے۔ جس نے اپنی بعض تحریروں میں افلاطون کی عظمتِ کردار

---

* "اسرار" کے پہلے ایڈیشن (۱۹۱۵ء) میں انہوں نے افلاطون اور حافظ کو براہ راست نشانہ بنایا تھا لیکن جب
بعض طبقوں نے بالخصوص حافظ پر جو انہوں نے اشعار کہے تھے اُس کا برا مانا اور اسکے خلاف احتجاج کیا تو اقبال
نے "اسرار" کے دوسرے ایڈیشن سے حافظ کے متعلق اشعار حذف کر کے "در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ
اسلامیہ" کے عنوان سے ایک نیا باب لکھا، البتہ افلاطون کے متعلق بیشتر اشعار کو جوں کا توں رہنے دیا۔

اور صحتِ افکار قریب قریب دونوں سے انکار کیا ہے*

بات یہ ہے کہ افلاطون کی پرخلوص اور ہمہ گیر شخصیت نے جہاں ایک طرف فلسفیانہ غور و فکر کی نہائت بلند روایات قائم کی ہیں وہاں اس کے بعض تصورات ایسے بھی ہیں جنکو واقعی خطرناک یا سطحی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اسکی اہم ترین تصنیف "ری پبلک" (REPUBLIC) کو لیجئے۔ اس میں افلاطون نے ایک مثالی ریاست کا خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ ریاست جسمیں سلطنت کا کاروبار فلسفیوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ افلاطون کے خیال میں عدل و انصاف کی بہترین ضمانت ہے۔ مگر اس کے لئے جو معاشرتی نظام پیش کیا گیا ہے اس سے اتفاق کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً مجوزہ ریاست میں نکاح کے اصول کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ بہترین نسل پیدا کرنے کے لئے بہترین مردوں اور عورتوں کو بغیر کسی معاشرتی عہد و پیمان کے آپس میں ملنے کا موقع دیا جائے گا اور بچے قوم کی 'ملک' ہوں گے جنکو پیدا ہوتے ہی والدین سے الگ کر لیا جائیگا۔ یہ بات ضروری ہے کہ والدین کو بچوں کا اور بچوں کو والدین کا علم نہ ہو۔ صرف اسی طریقہ سے آفاقی قسم کا بھائی چارہ وجود میں آسکتا ہے کیونکہ اس طرح مجوزہ ریاست میں ہر شخص لامحالہ دوسرے کو اپنا بھائی سمجھے گا۔"**

افلاطون نے کہا ہے کہ صحت مند بچوں کو ریاست کے حوالے کر دینے کے بعد والدین کو آپس میں یا دوسرے مردوں اور عورتوں سے آزادانہ اختلاط کا حق ہوگا بشرطیکہ

---

* خصوصیت سے رسل کی یہ کتابیں (متعلقہ ابواب) دیکھئے:

(1) A HISTORY OF WESTERN PHILOSOPHY

** "ریاست" مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو، صفحہ ۲۹۱

(2) UNPOPULAR ESSAYS

وہ "ہر ایسے بچے کے اسقاط کی انتہائی کوشش اپنے ذہن میں رکھیں جو اس ناجائز اختلاط کے نتیجے میں متوقع ہو۔"*

لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم مخلوط طریق پر ہوگی جس میں موسیقی اور ثقافت جسمانی پر خصوصی توجہ دی جائے گی ۔ لڑکوں کے ساتھ ورزش کرتے وقت لڑکیوں کو بھی نیم برہنہ ہونا پڑیگا۔ کیونکہ افلاطون کے اپنے الفاظ میں اس مثالی ریاست کے لوگوں کے لئے "نیکی کا لباس جس میں وہ ہمہ وقت ملبوس ہونگے کافی سمجھا جانا چاہیئے۔"**

اس طرح ریاست کے تمام لڑکے اور لڑکیاں بیس برس کی عمر تک تعلیم و تربیت حاصل کریں گے ۔ اس کے بعد جو لوگ مزید تعلیم کے اہل نہ ہوں گے، ان کو کسان، مزدور اور دکاندار وغیرہ بن کر "کاروباری" زندگی اختیار کرنی ہوگی اور یہ ریاست کا نچلا طبقہ ہو گا۔ لیکن جو لڑکے اور لڑکیاں مزید تعلیم کے اہل قرار دیئے جائیں گے، وہ مزید دس سال تک زیر تربیت رہیں گے ۔ اس مدت کے خاتمے پر دوسرا امتحان ہوگا اور ایک اور چھانٹ عمل میں لائی جائے گی۔ جو لوگ اس سے اعلےٰ تعلیم کے قابل سمجھے جائیں گے ۔ وہ ملک کے "محافظ" ہوں گے اور ان کو افواج میں شامل کر لیا جائے گا ۔ یہ ملک کا درمیانہ طبقہ ہونگے ۔ لیکن جن لوگوں کا ذوق اور ذہانت ان کو اعلےٰ تعلیم کے اہل ثابت کرے گی، ان کو مزید پانچ برس کے لئے فلسفہ و حکمت کی تعلیم اور پندرہ برس کے لئے "امور سلطنت" کی عملی تربیت دی جائے گی ۔ اس طرح پچاس برس کی عمر میں یہ مرد اور عورتیں (بلا تخصیص جنس) فلسفی حکمرانوں کے اعلےٰ طبقے میں شامل کر لئے جائیں گے ۔ عدل و انصاف کی خاطر

---

* ایضاً صفحہ ۳۰۰

** ایضاً صفحہ ۲۹۸ تا ۲۹۹، نیز دیکھئے صفحہ ۲۷۸

اور اس خیال سے کہ حکمران طبقہ حرص و آز اور خود غرضی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ ان فلسفی حکمرانوں کی نہ کوئی جائداد ہوگی، نہ گھر بار اور نہ بیوی بچے۔ ان کو سرکاری ہوٹلوں سے کھانا ملیگا۔ ایک ساتھ رہنے اور سونے کے لئے سرکاری بیرکیں BARRAKS مہیا کی جائیں گی اور عمدہ نسل کی افزائش کے لئے ان کو بھی وہی جنسی آزادی حاصل ہوگی جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے۔

ظاہر ہے کہ ان تصورات کو اسلامی کیا، عام اخلاقی معیار پر پرکھا جائے تو بھی ان میں بہت سی باتیں قابلِ اعتراض قرار دی جائیں گی*۔ لیکن اقبال نے افلاطون کے ان معاشرتی یا سیاسی تصورات سے کچھ تعارض نہیں کیا۔ ان کا حملہ دراصل افلاطون کے

---

* برٹرینڈرسل اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے: "افلاطون کا کمال یہ ہے کہ اس نے تنگ نظری کے خیالات کو کچھ ایسے ڈھنگ سے پیش کیا کہ آنے والی نسلیں اس سے دھوکا کھا گئیں۔ صدیوں تک ری پبلک کی تعریف کی گئی۔ لیکن کسی نے نہ جانا کہ اسکی تجاویز میں کیسی کیسی مضرت رساں باتیں مضمر ہیں۔

(تاریخ فلسفۂ مغرب: ۱۲۵)

ایک اور جگہ رسل نے لکھا ہے: "جب ہم پوچھتے ہیں: افلاطون کی ریاست کر کے کیا دکھائیگی؟ تو اسکا جواب پھیکا سا ہے۔ یہ اندازاً اپنے جتنی آبادیوں کے مقابلے میں جنگ جیتے گی اور لوگوں کی ایک تھوڑی سی تعداد کے لئے روزگار مہیا کریگی۔ یہ علم و فن کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہ دیگی کیونکہ اسکے کرشے سے اس بات کی توقع ہی نہیں۔ اور باتوں کے علاوہ وہ اس لحاظ سے بھی اسپارٹا کی مانند ہوگی۔ تمام شیوہ بیانی کے باوجود جو کچھ یہ ریاست کریگی وہ بس اسقدر ہے کہ جنگ میں مہارت اور کھانے کو وافر۔ ایتھنز میں افلاطون کو قحط اور شکست دونوں کا تجربہ ہوا تھا۔ غالباً نیم شعوری طور پر وہ سمجھنے لگا تھا۔ ان دو قباحتوں سے محفوظ رہنا سیاست اور تدبر کی معراج ہے۔" (ایضاً: ۱۲۶)

خالص فلسفیانہ نظریات پر ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اپنے تمام ذوقِ عمل اور اصلاحِ معاشرت کے جوش و خروش کے باوجود افلاطون اس دنیا کو کوئی ٹھوس حقیقت قرار نہیں دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اصل حقیقت خدا کے تصور میں ہے جس کا تعلق کسی اور ہی دنیا، فلک الافلاک یا عالمِ بالا سے ہے۔ اور جو دنیا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے جس میں ہم چلتے پھرتے اور رہتے بستے ہیں، یہ اس اصلی اور حقیقی دنیا کا محض ایک عکس ہے جس کی اپنی کوئی واقعیت نہیں۔ اپنے اس خیال کی وضاحت کے لئے اس نے "غار" کی مشہور تمثیل سے کام لیا۔ اس نے کہا ہم دنیا والوں کی مثال ایسی ہے جیسے چند انسانوں کو قید کر کے اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر ان کو ایک غار میں دھکیل دیا جائے۔ اس حال میں کہ ان کی پشت غار کے منہ کی طرف ہو، ان کی نظریں غار کے اندر سامنے کی دیوار پر گڑی ہوں اور وہ پیچھے یا دائیں بائیں مڑ کر دیکھ نہ سکتے ہوں۔ اب اگر ان کے پیچھے چند قدم پر آگ جلائی جائے تو لامحالہ سامنے دیوار پر چند پا بہ جولاں قیدیوں کے سائے لہرا اٹھیں گے۔ غار کی دیوار پر پڑنے والے سائے کی جو حیثیت ہے بس وہی ہماری دنیا اور ہم دنیا والوں کی ہے۔ یہ دنیا جس کو ہم حقیقی جان کر اس پر جان دیتے ہیں، دراصل غیر حقیقی اور نظر کا فریب ہے۔

اس مختصر (بظاہر بے ضرر) سے تصور نے آنے والی نسلوں کو بے حد متاثر کیا، اور اس سے ایسے ایسے نظام ہائے فکر پیدا ہوئے جنہوں نے بڑے واضح اور واشگاف لفظوں میں اس دنیا اور دنیوی جد و جہد کو نظر کا دھوکا اور نگاہ کا فریب قرار دیا۔ اس سے رہبانیت اور ترکِ دنیا کی بے شمار تحریکیں عالمِ وجود میں آئیں اور افراد نہیں، بلکہ جماعتوں کی جماعتیں معاشرت کی ٹھوس ضرورتوں اور حواس کے عملی تقاضوں سے

منہ موڑ کر کہیں ریاضت اور چلہ کشی میں اور کہیں تن آسانی اور عیش پرستی میں کھو گئیں۔ عباسیوں کے دورِ سلطنت میں جب مسلمانوں کے اندر عراق اور شام کے عیسائیوں اور یہودیوں کی بدولت یونانی علوم کا چرچا ہوا اور افلاطون اور اس کے ماننے والے مفکروں (جن کو فلسفہ کی اصطلاح میں نو افلاطونی کہا جاتا ہے) کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں تو اس سے مسلمانوں کے ذہن نے لامحالہ اثر قبول کیا۔ اور پھر جوں جوں یہ خیالات اور تصورات ان میں راسخ ہوتے گئے عمل کا وہ ولولہ اور جدّوجہد کا وہ جذب و شوق جس نے دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کو آدھی دنیا کا حکمران بنا دیا تھا، سرد پڑ گیا اور رہبانیت، اور بے عملی کے رجحانات نے زور پکڑا۔ اقبال نے ایک عمیق نظر محقق کی طرح جب مسلمانوں کی صدیوں کے انحطاط کے پیچھے ان تصورات کی زہرناکی کو پا لیا تو وہ ایک پُر جوش مصلح کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔

'اسرار' میں افلاطون کے متعلق کل اکیس شعر ہیں۔ پہلے ہی شعر میں اقبال نے افلاطون کو 'راہبِ دیرینہ' (پرانے زمانے کا ایک سادھو) اور 'گوسفندِ قدیم' (اگلے وقتوں کی ایک بھیڑ) کہا ہے۔* اس سے گزشتہ باب میں جو حکایت ہم نے مطالعہ کی ہے اس کا مضمون فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔ افلاطون کے عین شباب میں اس کے وطن ایتھنز کو یونان کی ایک دوسری ریاست اسپارٹا کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی تھی اور ایتھنز کچھ عرصہ محکوم رہنے کے بعد ڈکیٹٹروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ افلاطون کے بہت سے نقادوں نے اس کے فکر و ذہن پر اس اہم واقعہ کے اثرات کو تسلیم کیا ہے۔ اقبال نے ان اثرات کی طرف براہِ راست تو کہیں اشارہ نہیں کیا مگر گذشتہ

---

* راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم — از گروہِ گوسفندانِ قدیم

باپ کی حکایت اور گوسفند قدیم کے مضمرات کو نگاہ میں رکھا جائے جو ادھی بیشتر نے بھی احساس کی کی ہی کے زیرِ اثر دینِ گوسفندی کا پرچار شروع کیا تھا، تو مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

تمثیلِ غار اور نظریۂ اعیانِ نامشہود کے بعد افلاطون کے جس نظریے نے نسلِ انسانی پر غیر صحت مند اثرات ڈالے ہیں وہ اس کا نظریۂ علم ہے۔ جس میں حواس کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کو غیر یقینی قرار دیا گیا ہے۔ "اس نظریے کی رو سے '۲ + ۲ = ۴' تو حقیقی علم ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ 'برف سفید ہے'، ایک ایسی مبہم اور غیر یقینی بات ہے کہ اسے فلسفی اپنی صداقتوں کے زمرے میں شامل نہیں کر سکتا۔" *

اس نظریے کی مقبولیت سے سائنسی اور تجرباتی علم کو جس میں حواس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اپنا حق منوانے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، اس سے قطع نظر، اس کا سب سے زیادہ نقصان تصوف اور الٰہیات کی راہ سے عالمِ انسانی اور بالخصوص مسلمانوں کو پہنچا۔ جب حواس اپنا اعتبار کھو بیٹھے تو دنیوی جدوجہد اور سعی و عمل جس کی انجام دہی میں حواس کو بڑا دخل ہے خود بخود نظروں سے گر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رہبانیت اور ترکِ دنیا کے رجحانات کو اور تقویت حاصل ہوئی۔ اقبال نے تیرے شعر میں افلاطون کے اسی نظریۂ علم کو ہدفِ ملامت ٹھہرایا ہے: حکیم افلاطون وہ شخص ہے جس پر دنیا محسوس کا ایسا جادو چلا کہ اس کے نزدیک ہاتھ، آنکھ اور کان وغیرہ (یعنی عالمِ محسوس: CONCRETE WORLD) کی کوئی قیمت باقی نہ رہی:

آنچناں افسونِ نامحسوس خورد　　　　اعتبار از دست و چشم و گوش برد

ایک اور لحاظ سے بھی افلاطون اقبال کی نظر میں قابلِ مواخذہ ہے۔ اگرچہ حسبِ توفیق افلاطون نے رزمیں کے ہنگاموں میں بھی دلچسپی لی تھی لیکن اس کے فکر کی تان مجموعی طور پر

---

* برٹرینڈ رسل، تاریخِ فلسفہ مغرب : ۱۷۱

ماورائے دنیا پر ہی ٹوٹتی ہے۔ اس کا سبب اس کی طبیعت کا وہ میلان تھا جسے انگریزی میں OTHER WORLDINESS کہتے ہیں اور جسے میں کسی موزوں لفظ کی عدم موجودگی میں 'عقبیٰ پرستی' سے ادا کرتا ہوں۔ یہ رجحان جب اپنی مناسب حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تو انسان کی نظر میں زندگی کی اہمیت کم اور موت کی حیثیت بڑھ جاتی ہے (کیونکہ اس نقطۂ نظر کی رُو سے موت کی بدولت ہی انسان کو حقیقت کا قرب و ادراک حاصل ہو گا)۔ چوتھے شعر میں افلاطون کی اسی عقبیٰ پرستی یا موت پسندی پر چوٹ ہے: افلاطون وہ شخص ہے جس نے کہا۔ 'زندگی کا راز موت میں پوشیدہ ہے۔ شمع جب بجھ جائے تو صد جلوے دکھاتی ہے۔

اس بات کو ضربِ کلیم میں ایک جگہ بڑے دلنشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افلاطون، سپائی نوزا اور اقبال کے درمیان جو نقطۂ نگاہ کا اختلاف ہے۔ اسے اقبال نے تین اشعار میں سمو دیا ہے۔ تین اشعار کی اس مختصر نظم کا عنوان ہے 'مقصود'۔ سب سے پہلے سپائی نوزا کا نقطۂ نظر بیان ہوا ہے:

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند　　　حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

سپائی نوزا نے حیات کو جو مقصودِ نگاہ ٹھہرایا ہے، اس کے مقابلے میں افلاطون کا ارشاد یہ ہے کہ حیات کی بجائے موت کو مقصودِ نگاہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ حیات نہایت عارضی، اور بے ثبات شے ہے:

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند
حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمو

ان دونوں عظیم فلسفیوں کے مقابلے میں اقبال کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انسان کی نظر خود اپنی ذات کے امکانات اور اس کی تکمیل پر ہونی چاہیئے۔ موت و حیات کا مسئلہ فی نفسہٖ کچھ

زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے:

حیات و موت نہیں التفات کے لائق　　فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

بس یہی تین تصورات ہیں: (۱) افلاطون کی رہبانیت؛ (۲) اس کا نظریۂ علم اور (۳) اس کی عقلی پرستی، جن کی بنا پر اقبال نے اس یونانی فلسفی کو ہدفِ ملامت ٹھہرایا ہے اور اس کے اثرات کو مسلمانوں کے حق میں تباہ ناک قرار دیا ہے۔ زیرِ نظر باب کے بقیہ آدھے سے زیادہ اشعار شاعرانہ انداز میں افلاطون کی مذمت پر مشتمل ہیں۔ ان میں اقبال کہتے ہیں: افلاطون کا ہرن 'لطفِ خرام' سے اور اس کا کبک 'لذتِ رفتار' سے بے بہرہ ہے۔ اس کی شبنم 'طاقتِ رم' سے اور اس کا دانہ 'ذوقِ نمو' سے خالی ہے۔ اس کے طائر کے سینہ میں دم نہیں اور اس کے پروانے کے دل میں تڑپ نہیں۔ اور آخر میں کہتے ہیں کہ اس کی شراب سے قوموں کے ذہن ایسے مخمور و مسموم ہوئے کہ وہ لمبی تان کر سو گئیں اور ذوقِ عمل سے محروم ہو گئیں:

قومہا از سُکرِ اُو مسموم گشت
خُفت و از ذوقِ عمل محروم گشت

حافظ

حافظ شیرازی (وفات ۱۳۸۸ء) پر جو اشعار اقبال نے لکھے تھے چونکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کو حذف کر دیا گیا۔ اس لئے ان کا تفصیلی مطالعہ یہاں ضروری نہیں۔ بس اس قدر جان لینا کافی ہوگا کہ جس لب و لہجہ میں انہوں نے حافظ کے لئے بھی روا رکھا۔ ان اشعار میں حافظ کو 'صہبا گسار و فقیہہ ملّتِ مے خوارگان'، اور 'امامِ امتِ بےچارگان' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے، اور اس کی سہل انگاری، عافیت پسندی اور عیش کوشی کی سخت برائی کی گئی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ اس کی محفل 'مے'، عالی ہمت اور حریت پسند شریف زادوں کے لائق نہیں۔ ہر اچھے انسان کو ان 'بھیڑوں'

کی صحبت سے بچنا چاہیئے:

محفلِ او در خورِ ابرار نیست　　ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر　　الحذر از گوسفنداں الحذر

اِن اشعار سے مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بہت سے لوگ حافظ کی شاعری اور ان کے تصوّف کی حمایت میں صف آرا ہو گئے۔ اس معرکہ آرائی سے جس میں قائدِ حزبِ اختلاف کے فرائض زیادہ تر خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انجام دیئے، جہاں بے مزگی اور ناخوشگواری کے کچھ پہلو اُبھرے، وہاں علم و ادب کی دنیا کو دو بڑے فائدے پہنچے۔ اوّل یہ کہ اس بحث و تمحیص کی بدولت عجمی شعر و تصوّف کے متعلق اقبال کے موقف کی پوری طرح وضاحت ہو گئی۔ کیوں کہ معترضین کے جواب میں انہیں مجبوراً قلم اٹھانا پڑا اور کتنے ہی مضمون اور خط اس موضوع پر لکھے۔ دوم، حافظ کے متعلق اپنے ۳۵ اشعار حذف کر کے "اسرار" کے دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے ۷۰ کے قریب اشعار میں اپنے ادبی نقطۂ نظر کو بہ تفصیل بیان کیا۔ اس طرح اس علمی جدل و تکرار کے نتیجے میں اقبال کی نظم و نثر دونوں کی ثروت میں اضافہ ہُوا۔

حافظ کے متعلق اپنے اندازِ تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے ان میں سے ایک مضمون* میں لکھتے ہیں:-

"شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں۔ جہاں تک فن کا تعلق ہے۔ یعنی جو مقصد اور شعرا پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ خواجہ حافظ اسے ایک لفظ میں حاصل کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ وہ انسانی قلب کے راز کو پورے طور پر سمجھتے ہیں لیکن فردی اور ملّی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے

---

* مطبوعہ "وکیل" امرتسر بابت ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء، بحوالہ سہ ماہی "اقبال" لاہور اکتوبر ۱۹۵۲ء ص ۹۶، ۹۷

کے لئے کوئی معیار ہونا چاہئے۔ میرے نزدیک وہ معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار اغراضِ زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے ....

جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والے کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حالت اُن افراد و اقوام کے لئے جو اس زمان و مکاں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ نہایت ہی خطرناک ہے۔ حافظ کی دعوت موت کی طرف ہے، جس کو وہ اپنے کمالِ فن سے شیریں کر دیتے ہیں تاکہ مرنے والے کو اپنے دکھ کا احساس نہ ہو۔"

عجمی تصوف

حافظ پر ان کا اعتراض دراصل حافظ کی ذات یا ان کے شاعرانہ کمال پر نہیں بلکہ اُس تمام شعری سرمائے اور صوفیانہ ادب پر تھا جس کی آبیاری نظریۂ وحدت الوجود کے سرچشمے سے ہوئی ہے۔ یہ نظریہ جس کے ڈانڈے یونانی الٰہیات اور قدیم ہندوی ویدانت سے جا ملتے ہیں۔ مختصراً یہ ہے کہ پوری کائنات وحدتِ حیات کے رشتے میں پروئی ہوئی ہے: خدا مخلوق سے الگ کوئی ہستی نہیں بلکہ نظامِ عالم میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ زندگی کا ہر مظہر حقیقت میں مظہرِ خداوندی ہے۔

اس نظریہ کا ایک اچھا پہلو بھی تھا۔ اس سے انسانوں کی اخوت، مساوات، اور ایک ہی شاخ سے پھوٹنے والے گلہائے رنگا رنگ کا محبت آفریں تصور عام ہوتا ہے، لیکن اس بظاہر معصوم سے نظریے سے اسلامی تاریخ میں جس طرح صدیوں افکار کشید کئے گئے، اس نے عمل کے جذبے اور اخلاق کی حس دونوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ جب خدا ہر

چیز میں ہے تو نیک میں بھی وہی ہے اور بدکار میں بھی وہی۔ اور جب ہر نیک و بد میں اس کا جلوہ ہے اور ہر نیک و بد اسی کا مظہر ہے تو نیکی اور بدی کی تمیز کو شدت کے ساتھ قائم رکھنا اور نیک و بد میں امتیاز کرنا کہاں کی دانشمندی ہے! پھر جب خدا کے سوا ہر شے بذاتِ خود موہوم اور غیر موجود ہے تو کسی انسان کو اس کے افعال کا ذمّہ دار کیونکر ٹھہرایا جا سکتا ہے! ہمارے بُرے اور بھلے اعمال بظاہر ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کی ذمّہ دار ہستی موجود ہے۔ ہم غیر موجود، تو اسکی مشیت کے محض آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں*۔ اور جب افعال کی ذمّہ داری کا احساس ڈھیلا پڑ جائے تو اخلاق کی بے راہروی کو کون روک سکتا ہے۔ اسی طرح جب کفر بھی شانِ خداوندی کا ایک نشان ہے اور اسلام بھی ایک نشان تو پھر جہاد اور جد و جہد اور یہ دوڑ دھوپ کس لئے؟

مختصر یہ کہ اس نظریے کے بیج سے جو پودا پھوٹا جب وہ تناور درخت بنا تو اس کی شاخ شاخ اور خوشے خوشے سے ایسا پھل ٹپکا جو بظاہر میٹھا مگر حقیقت میں ایسا زہر بھرا تھا کہ جس نے ایک بار چکھ لیا اسکے ارادے مضمحل، اسکی آرزوئیں پراگندہ اور اس کے دست و بازو شل ہو گئے۔

---

* تصوف کے یہ افکار جب فارسی شعر کے ایوانوں میں گونجے تو ان کی صدائے بازگشت اُردو کی بزمِ سخن میں بھی سنائی دے گئی۔ چنانچہ میر تقی میرؔ کے یہ اشعار:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

اقبال نے اپنے متذکرہ بالا مضامین اور خطوط میں ان زہریلے اثرات کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور حافظ کے علاوہ حکیم سنائی اور ملا حسن گیلانی وغیرہ کے اشعار سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان شعراء نے بڑے دلفریب طریقوں سے "شعار اسلام کی تنسیخ و تردید کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم ٹھہرایا ہے" انہی مثالوں میں سے ایک مثال انہوں نے ایک پنجابی شاعر کی بھی دی ہے جس کا بیان دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں:

" وجید خاں ایک پنجابی شاعر تھا جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفۂ ویدانت .... (ویدانت اور وحدت الوجود ایک ہی چیز ہے) کا قائل ہو گیا تھا۔ اس تبدیلی خیال و عقیدہ نے جو اثر اس پر کیا اسے وہ خود بیان کرتا ہے:

تھے ہم پوت پٹھان کے دَل کے دَل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا۔ مگر جب سے رگناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے۔ میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا۔ کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔" اس کے بعد اقبال کہتے ہیں "کاش وجید خاں کو یہ معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہی دکھ اٹھانے اور دکھ پہنچانے کی قوت رکھنے کا ہے۔ زندگی کا مقصد زندگی ہے نہ موت"*

اقبال نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ اسلام اور وحدت الوجود جو بظاہر مشابہ نظر آتے ہیں حقیقت میں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام کا انداز نظر صحت مندانہ

---

* سہ ماہی "اقبال" لاہور اکتوبر ۵۳ء، صفحات ۹۴، ۹۵۔

حقیقت پسندانہ ہے۔اس کا سارا زور عمل اور جدوجہد پر ہے۔ وہ فنا نہیں بقا اور استحکام کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وحدت الوجود اپنی تمام فلسفیانہ چمک دمک اور روحانی اپیل کے باوجود رہبانیت کی ایک تحریک ہے جو عمل کی بجائے بے عملی اور استحکامِ ذات کی بجائے خودکشی کی طرف بلاتی ہے۔

حقیقتِ شعر

لیکن ہمارے اس مطالعہ میں ان مضامین اور خطوط سے بھی زیادہ اہم وہ اشعار ہیں جو انہوں نے حافظ سے متعلق اپنے اشعار کی جگہ "اسرار" کے آٹھویں باب میں درج کئے۔ یہ باب جس کا عنوان "در حقیقتِ شعر و اصلاحِ ادبیاتِ اسلامیہ" ہے چار بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں ایک اچھے اور سچے شاعر کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ دوسرے بند میں ان شاعروں کا ذکر ہے جو شعر و ادب کے زندگی بخش تصوّر سے محروم ہونے کے باعث ایسی شاعری کی تخلیق کرتے ہیں جو قوموں کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ تیسرے بند میں اس قوم کی حالت پر افسوس کا اظہار ہے جو سچے شاعروں کی دلسوزی اور پیامبری سے متاثر ہونے کی بجائے مردہ ذوق شاعروں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے، اور چوتھے بند میں نئی نسل کو خطاب کر کے اس امر پر زور دیا ہے کہ وہ نیک و بد اور زہر و تریاق میں تمیز کرنا سیکھے اور شعر و ادب کی اُن قدروں کو اپنائے جو زندگی میں ممد و معاون ہوں، جن سے دلوں میں تازگی، ہمّت میں بلندی اور ارادوں میں پختگی پیدا ہو۔ اب آیئے اس باب کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کریں۔

اقبال نے پہلے بند کا آغاز تمنّا اور آرزو کی تعریف سے کیا ہے۔ آرزو کے بغیر انسان کے دل میں گرمی و حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ زندگی میں جوش و جذبہ اور قوتِ تسخیر

آرزوؤں کا تیمہ ہے۔ شاعر کے تخلیقی عمل کے پس پردہ بھی کچھ آرزوئیں بے تاب اور کچھ تمنائیں مچل رہی ہیں
اُسے حسن اور خیر کی تلاش ہے۔ زندگی کے ارتقا میں حسن کو بڑا دخل ہے۔ حسن آنند کا خالق اور اسکی
بہاروں کا پروردگار ہے۔ دگویا شعر کی تخلیق حسن کی لگن کا ایک کرشمہ ہے، حسن سے وابستگی
کی بدولت شاعر کا سینہ خود حسن کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اس کے اندر سے جمال و دلبری کی
نئی ادائیں اور زندگی کے تازہ ممکنات ابھرتے ہیں*۔ ایسا شاعر جو حسن سے صحیح تاثر قبول کر کے
گیسوئے حیات کو سنوارنے کی مہم پر نکلتا ہے، اپنے اندر بڑی قوت اور کشش رکھتا ہے۔ اس
کے فن کی بدولت زندگی اور فطرت دونوں کی جاذبیت بڑھتی ہے۔ اس کی آب و گل میں بحر و
بر کی وسعتیں اور اس کے دل میں سو جہانِ تازہ کے امکانات چھپے ہوتے ہیں**۔ اس کا دماغ
ان کھلے پھولوں کی مہک سے اور ان سُنے گیتوں کی نغمگی سے معمور ہوتا ہے***۔ اس کی فکر ماہ و انجم
کی ہم نشیں، شر سے بیگانہ اور حسن و خیر کا گنجینہ ہوتی ہے۔ اسکی آوازِ درا ماندہ قافلوں کی
رہنمائی کرتی ہے۔ وہ زندگی کی پیچ در پیچ اور تاریک راہوں میں خضر کا کام دیتا ہے، اور
اس کی بدولت ہم چشمۂ حیواں تک پہنچتے ہیں۔ بند کے آخر میں کہتے ہیں۔ ایسے شاعر کا فن
دوسروں کو اپنا محاسبہ کرنا اور ترقی و ارتقا کی خاطر بے قرار رہنا سکھاتا ہے اور وہ اپنے سوز
و تپش کی نعمت کو اس قدر ارزاں کر دیتا ہے کہ اہلِ دنیا میں سے جو چاہے اس سے فیضیاب ہو:

از فریبِ او خود افزا زندگی ؛ خود حساب و ناشکیبا زندگی
اہلِ عالم را صلا بر خواں کند ؛ آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

---

* سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن ؛ خیزد از سینائے او انوارِ حسن

** بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش ؛ صد جہانِ تازہ مضمر در دلش

*** در دماغش نادمیدہ لالہ ہا ؛ ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا

دوسرے بند میں جہاں زندگی کی تڑپ سے ناآشنا شاعر کے زہریلے اثرات کا بیان ہوا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ایسے شعراء کا وجود قوموں کی سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ کیونکہ ان کا فن ہر چیز سے زندگی کا حسن اور جوشِ نمو چھین لیتا ہے اور اپنے پڑھنے والوں پر موت کا سکون طاری کر دیتا ہے۔ یونانی علم الاصنام میں تین پریوں کا ذکر ہے۔ جن کا آدھا جسم مچھلی کا اور آدھا جسم انسان کا بتایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ملاح سمندر میں رہنے والی اُن پریوں کی خوش آوازی سے مسحور ہو کر راستہ بھول جاتے اور جہاز چٹانوں سے ٹکرا کر یا موجوں کی لپیٹ میں آکر غرق ہو جاتے۔ اقبال نے زندگی سے فرار ڈھونڈنے والے اور بے عملی کا درس دینے والے شاعر کو ان فریب کار بنات البحر (سمندر کی بیٹیوں) سے تشبیہ دی ہے۔ ان کے سحر سے زندگی کے جہاز ڈوب جاتے ہیں:

ماہی و از سینہ تا سر آدم است   چوں بناتِ آشیاں اندیم است

از نوا بر ناخدا افسوں زند   کشتیش در قعرِ دریا افگند

'اسرار' کے ان اشعار کے کوئی بیس برس بعد اقبال نے شعرِ عجم کے عنوان سے جو ایک مختصر نظم (ضربِ کلیم، مطبوعہ ۱۹۳۶ء) لکھی۔ اس میں اپنے اس خیال کو یوں بیان کیا ہے:

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلآویز

اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں

بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

تیسرے بند میں جہاں ملّتِ اسلامیہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اس شاعری نے تیری رگوں کا خون منجمد کر دیا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے تجھے کانوں کے ذریعے

زہر پلایا گیا ہے جیسے وہاں بیشتر اشعار اس مریضانہ تصورِ عشق کے متعلق ہیں جو فارسی اور اردو شاعری کے رگ و ریشہ میں سما چکا تھا۔ "اسرار" سے پہلے مولانا حالی نے اپنے مقدمۂ دیوان میں اردو شاعری کے روائتی عاشق کے مضحکہ خیز کردار پر نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن اقبال کی یہ ضرب زیادہ کلیمانہ اور بھرپور ہے۔

کہتے ہیں عشق و محبت جیسا پاکیزہ اور زندگی بخش جذبہ اس شاعری کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا ہے۔ اس کی خودداری، آبرومندی اور بلند نظری خاک میں مل گئی ہے۔ اس کی نفسیات اس حد تک بگڑ گئی ہے اور اس کی ذہنیت اس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ سوائے دریوزہ گری، افسردگی، بیچارگی اور نامرادی کے اس میں کچھ باقی نہیں۔ آسمان کی شکایت کرنا، اپنی قسمت کا رونا رونا اور آتشِ رشک و حسد میں جلتے رہنا اس کی حیات کا وظیفہ ہے۔ اس کے احساسات پر خوفزدگی، مردہ دلی اور ناتوانی مسلط ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ناخوشے افسردۂ آزردۂ — از لگد کوبِ نگہباں مردۂ *
پست بخت و زیردست و دوں نہاد — نا سزا و نا امید و نامراد
شیونش از جانِ تو سرمایہ برد — لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ برد **

---

* اے دلت از نغمہ ہایش سرد جوش — زہرِ قاتل خیزد از داہ گوش

* از لگد کوبِ نگہباں مردۂ یعنی پاسباں کی مار پیٹ سے ادھ موا۔ یہ مصرع غالب کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

** یعنی اس شاعر کے رونے دھونے نے تیری متاعِ زندگی کو لوٹ لیا ہے اور اس کی آہ و بکا سے ہمسائے بیچارے پر نیند حرام ہو گئی ہے۔ میر کے دو شعر ملاحظہ ہوں: (باقی اگلے صفحہ پر)

اس بند کے آخری شعر میں فرماتے ہیں افسوس ہے اُس عشق (یعنی اُس عاشق و شاعر) پر جس کی غیرت کا شعلہ اور حمیت کی آگ بجھ گئی ہو اور جو حرم کی ولولہ انگیز فضاؤں میں پیدا ہو کر بتکدے کی بے عمل اور سکون پرست بستی میں مرے:

وائے بر عشقے کہ نارِ اوُ فسرد
در حرم زائید و در بُت خانہ مُرد

آخری بند میں نئی نسل کے سامنے ادب کا صحیح نصب العین پیش کیا ہے۔ ادب زندگی سے الگ کوئی شے نہیں۔ اسے زندگی کے معیار پر پرکھ کر دیکھو۔ جو چیز زندگی میں کھوٹی اور گھٹیا ہے وہ ادب میں بھی کھوٹی اور گھٹیا ہوگی۔ جو ادب عمل کی دعوت نہیں دیتا، جسم و جان میں سرگرمی اور جوش پیدا نہیں کرتا، مشکل پسند اور جفاکش نہیں بناتا وہ ادب در خورِ اعتنا نہیں۔ ادب کے لئے فکرِ روشن کے ساتھ فکرِ صالح کی بھی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں میں قومیت کا اعلیٰ احساس اور اسلام سے سچی محبت پیدا ہو:

فکرِ صالح در ادب می بایدت　　　رجعتے سوئے عرب می بایدت

اے مسلمان! تو نے عجم کے لالہ زاروں اور ہند کی بہاروں سے کافی لطف اٹھالیا۔ اب کھجور کی شراب پینے اور صحرا کی گرمی کھانے کا وقت ہے:

از چمن زارِ عجم گل چیدۂ　　　نو بہارِ ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمیٔ صحرا بخور　　　بادۂ دیرینہ از خرما بخور

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

جو اس شور سے میرؔ روتا رہیگا　　　تو ہم سایہ کاہے کو سوتا رہیگا
سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

تم ایک مدت تک حریر و پرنیاں میں لپٹے رہے ہو، اب اپنے آپ کو موٹے کپڑے کا عادی بناؤ:

مدتے غلطیدۂ اندر حریر   خو بہ کرپاس درشتے ہم بگیر

صدیوں لالہ و گل پر رقص کرتے رہے اور پھولوں کی طرح شبنم کے موتیوں سے منہ دھویا کئے ہو۔ اب اپنے آپ کو تپتی ہوئی ریت میں ڈالو اور چشمۂ زمزم میں غوطہ لگاؤ:

قرنہا بر لالہ پا کوبیدۂ   عارض از شبنم چو گل شوئیدۂ

خویش را بر ریگِ سوزاں ہم بزن   غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

تاکہ تم زندگی کی جنگ میں حصہ لینے کے قابل بن سکو اور تم میں وہ تڑپ اور سوز پیدا ہو جائے جس کے بغیر جینا بے سود ہے:

تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات

جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

صدیوں سے ہمارے مذہبی اعتقادات اور ادبی تصورات میں ایک خوفناک تضاد پایا جاتا تھا۔ خوفناک اس لئے کہ یہ شعوری کم اور نیم شعوری زیادہ تھا۔ بہت سے شعراء جو یوں تو اسلام کی صداقتوں پر ایمان رکھتے تھے، شعر کی دنیا میں ایک ایسی ذہنیت کو فروغ دیتے چلے گئے جس سے نہ صرف اسلامی تعلیمات کی بلکہ خود اسلام کی بطور ایک مذہب کے تضحیک و تخفیف ہوتی تھی۔ اس بات کے ثبوت میں صرف ایک مثال دیکھئے۔ میر تقی میر کا شعر ہے:

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ایسا نہیں کہ میر صاحب کا اسلام پر یقین کسی شخص سے کم تھا یا وہ اس مذہب کے اصول و تعلیمات سے برگشتہ یا دل برداشتہ تھے۔ ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ خدا اور رسول پر ان کا ایمان نہایت پختہ اور اسلام کے اصولوں پر ان کا یقین غیر متزلزل تھا۔ اس کے باوجود مندرجہ بالا شعر (اور اس قسم کے سیکڑوں اشعار میر اور دیگر شعرا کے ہاں ملتے ہیں) سے قاری جو تاثر قبول کرتا ہے وہ مذہبِ اسلام سے بے نیاز، بیزار یا بالاتر ہو کر زندہ رہنے کا ہے۔

بعض لوگ ان شعرا یا ایسے اشعار کے حق میں یہ دلیل لائیں گے کہ یہاں جس "اسلام" کے ترک کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد فقیہہ و ملا کا اسلام ہے اور "قشقہ" "دیر" کا مطلب کافری یا بے دینی نہیں بلکہ وسیع مشربی ہے۔ لیکن یہ محض خواص کی نکتہ آفرینیاں ہیں۔ عوام نیم شعوری طور پر اس قسم کے اشعار سے وہی تاثر قبول کرتے آئے ہیں جس کو ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس تضاد کا جو مدتوں سے ہمارے تحت الشعور کے نہاں خانوں میں چھپا بیٹھا تھا اور وہاں سے ہماری قوتِ حیات پر شبخوں مارتا تھا، سراغ لگا لیا اور پھر اس کو ایسا بے نقاب کیا کہ ذہنوں سے اس کے شعوری اور نیم شعوری اثرات مٹ کر رہ گئے۔ جن دنوں "اسرار" کی معرکہ آرائیوں کا میدان گرم تھا اور کچھ لوگ بزعم خویش "روایاتِ مقدسہ" کی حفاظت میں سر بکف نکل آئے تھے، اقبال نے ایک مضمون بزبانِ انگریزی بھی اس موضوع پر لکھا جو لکھنؤ کے اخبار نیو ایرا NEW ERA میں ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں اپنے تصوراتِ ادب کو سمیٹتے ہوئے ایک جگہ۔

۱؎ دیکھیے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی محققانہ تصنیف "میر تقی میر: حیات اور شاعری" مطبوعہ دہلی

لکھتے ہیں:

"تمام انسانی جدوجہد کا انجام تحفظ حیات ہے اور تمام انسانی علوم و فنون اسی مقصد کے حصول کے تابع ہیں۔ اس لئے ہر علم و فن کی منفعت کا اندازہ اس کی حیات آفریں قوت ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً اعلیٰ ترین فن وہ ہے جو ہماری جبلی قوتِ ارادی کو بیدار کرے اور ہمیں مصائبِ زندگی میں مردانگی سے مقابلہ کرنے کی طاقت بخشے۔ تمام خواب آور اثرات جو حقیقت (REALITY) سے گریز کرنے کی تعلیم دیں۔ فی نفسہٖ ایک پیغامِ انحطاط و ممات ہیں۔ ادبیات کو دنیائے افیون خوردہ کے نقوش سے مبرا ہونا چاہئے۔ فن برائے فن کا اصول زمانہ تنزل کی ایجاد ہے، جس کا مقصد ہمیں ذوقِ حیات اور جذبۂ عمل سے محروم کر دینا ہے۔"*

غرضکہ آج جو نظریۂ ادب ہر طرف مقبول ہو رہا ہے، جسمیں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی پر زور دیا جاتا ہے اور جسے بعض کم خبر ترقی پسند ادیب اپنا ہی حصہ اور اجارہ سمجھتے ہیں۔ اس نظریے کو جس شخص نے آج سے چالیس پینتالیس برس ادھر غیر معمولی بصیرت اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا وہ علامہ اقبال ہی کی ذات تھی۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں زندگی اور ادب کے باہمی رشتے کی اہمیت کو سب سے پہلے مولانا حالی نے (ایک حد تک سر سید کے زیرِ اثر) سمجھا اور سمجھایا۔ مگر ان کے تجزیے اور فکر میں حکیمانہ ژرف نگاہی اور فلسفیانہ عمق کی کمی تھی، جسکو کچھ عرصہ بعد اقبال نے پورا کیا۔

---

* دیکھئے "حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں"، از محمد عبداللہ قریشی۔ سہ ماہی "اقبال"، اپریل ۵۷ء

باب ۵

تربیتِ خودی کے مرحلے

خودی تخلیقِ مقاصد سے بیدار اور عشق و محبت سے پختہ ہو کر استحکامِ ذات کی جس
حد پر نکلتی ہے اقبال کے نزدیک اس کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ اطاعت، دوسرا ضبطِ
نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی ہے۔ "اسرار" کے نویں باب میں وہ اس موضوع سے بحث کرتے ہیں۔

مرحلۂ اوّل : اطاعت

اقبال نے ۱۹۱۲ء میں پہلی مرتبہ اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ دنیا میں حقیقی مسرت
خود سری اور آزادہ روی میں نہیں بلکہ ضابطہ دستور کی پابندی سے حاصل ہوتی ہے :

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں (شمع و شاعر)

تربیتِ خودی کا پہلا مرحلہ دراصل یہی ضابطہ پسندی اور آئین پر سختی کے ساتھ
عمل پیرا ہونے کا مرحلہ ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو آئین کا پابند نہیں بناتے یا تن آسانی
اور آرام طلبی کی بنا پر اس میں رخنے ڈالتے اور رخصتیں ڈھونڈتے ہیں وہ خودی کی تربیت
نہیں کر سکتے۔ اس طرح جو لوگ آزادی کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ جو جی میں آئے انسان کر
گزرے تو ایسے لوگ بھی اقبال کے نزدیک، زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر اور اس کی

فضیلتوں سے محروم رہتے ہیں۔ خودی کی تقویم کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جس آئین و مسلک کو ہم اپنے لئے پسند کرتے ہیں اسکو کما حقہٗ اختیار کریں اور صحیح معنوں میں اس پر عمل پیرا ہوں۔ اور اس راہ میں جو دقت بھی پیش آئے اسے خندہ پیشانی سے قبول کریں اور اپنے آپ کو سخت کوش اور محنت شعار بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔

یہاں اقبال خدمت گذار اور محنت شعار اونٹ کی مثال دیتے ہیں جو صبر و استقلال کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیتا ہے۔ وہ لق و دق صحرا میں سامان اور سواریوں کا بوجھ اٹھائے خاموشی کے ساتھ کڑے کوس طے کرتا ہے اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ یہی نہیں، وہ تپتے ہوئے صحراؤں میں خود اپنی رفتار سے ایک ایسا کیف محسوس کرتا ہے کہ اسکی بدولت صبر و برداشت میں اپنے سوار سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ کم کھاتا اور کم سوتا ہے مگر باربرداری اور راہ سفر کی صعوبتیں اٹھانے میں بے نظیر ہے۔

خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ 'محنت شعار' اشتر کی سی بے نفسی اور صبر و استقلال کا تقاضا کرتا ہے۔ جس طرح وہ 'کم خور و کم خواب و محنت پیشہ' ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی ذاتی آرام و آسائش کو بھول کر فرائض کی انجام دہی میں لگ جانا چاہیئے۔

یہاں اقبال تربیتِ نفس کا ایک ایسا اصول پیش کرتے ہیں جو ان سے پہلے مشرق و مغرب کے بہت سے مفکرین پیش کر چکے ہیں اور جس سے اکثر قوموں نے اپنے عروج کے زمانے میں فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اصول مختصراً یہ ہے کہ اختیار جبر سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پابندیٔ آئین سے انسان میں کچھ ایسے اوصاف ابھر آتے ہیں جن کی بدولت اسے اپنے نفس پر اور اپنے ماحول پر ایک تفوق، ایک قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ آئین پر سختی کے ساتھ پابند ہونے والے انسان میں ایک طرف تو سہل انگاری، آرام طلبی اور...

بے راہروی کے رجحانات مٹ جاتے ہیں اور دوسری طرف اسمیں خیال کی پختگی، ارادے کی مضبوطی اور سختیوں کو خاطر میں نہ لانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کردار کو وہ استحکام نصیب ہوتا ہے جو بالآخر اسے اپنے نفس اور ماحول کی طاقتوں پر غالب کر دیتا ہے اس طرح آخر میں حاصل ہونے والا اختیار (آزادی و قدرت) دراصل نتیجہ ہے۔ اُس جبر (اطاعت و مجبوری) کا جو ہم ابتدا میں اپنے اوپر روا رکھتے ہیں۔ اقبال نے اس خیال کو یوں پیش کیا ہے کہ اے حقیقت سے بے خبر! اطاعت گذاری اور فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کر کیونکہ اختیار جبر ہی سے پیدا ہوتا ہے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار

می شود از جبر پیدا اختیار

پھر حاشیہ پر اس شعر کی یوں وضاحت کی ہے: "اِس شعر میں الٰہیاتِ اسلامیہ کے مشہور مسئلہ جبر و اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ اور سچی حریت اطاعت یعنی پابندیٔ فرائض سے پیدا ہوتی ہے۔" اشعار میں اس کی توضیح یوں کی ہے کہ اطاعت گزاری اور فرماں پذیری سے ناقص انسان کے اندر بھی قابلیت کا جوہر پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر نافرمانی اور خودسری بھڑکتے ہوئے شعلے کو بھی راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ اس دنیا میں جس شخص نے بھی کوئی بڑا کام سر انجام دیا ہے اُس نے پہلے اپنے آپ کو آئین کی زنجیروں میں جکڑا ہے اور قانون کی سختیاں جھیلی ہیں۔ بغیر اس کے گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا:

ناکس از فرماں پذیری کس شود　　آتش از باشد ز طغیاں خس شود

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند　　خویش را زنجیریٔ آئیں کند

اس کے بعد اقبال نے اپنے اس خیال کے حق میں کچھ شاعرانہ دلائل پیش کئے

ہیں جو اغنچے میں بند رہ کر خوشبو بنتی ہے۔ خوشبو نافۂ آہو میں قید ہو کر مشک ہوتی ہے۔ ستارے منزل کی طرف اس لئے بڑھ رہے ہیں کہ وہ ایک قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوتے ہیں۔ سبزہ آئینِ نمو کی پابندی سے اُگتا اور بڑھتا ہے۔ اگر یہ آئین ترک کر دے تو پامال ہو جائے قطرے آئینِ وصل سے دریا اور ذرے آئینِ وصل سے صحرا بنتے ہیں۔ الغرض ہر شے کی باطنی قوت پابندیٔ آئین سے ہے۔ * اس لئے ضروری ہے کہ ہم بھی اس سرچشمۂ قوت یعنی پابندیٔ آئین سے فائدہ اٹھائیں۔

اب سوال یہ ہے کہ جب مختلف چیزوں کے لئے مختلف آئین ہیں اور ہر کوئی اپنے ہی آئین کی بدولت قوی اور طاقتور ہے تو ہم کونسا آئین اختیار کریں؟ قطروں اور ذروں کے لئے "آئینِ وصل" ہے اور سبزہ و گل کے لئے "آئینِ نمو" تو ہم مسلمانوں کے لئے کیا چیز آئین کا حکم رکھتی ہے؟ اقبال ہمیں آئینِ اسلام کا سختی کے ساتھ پابند ہونے کی ہدایت کرتے ہیں اور اس بات سے خبردار کرتے ہیں کہ ہم کہیں رسولِ اکرمؐ کے فرمان کی سرتابی نہ کریں یا احکامِ اسلام کی سختی کا شکوہ زبان پر لائیں۔ اگر ہم اپنی خودی کا استحکام چاہتے ہیں تو اس راہ میں کامیابی کی شرطِ اوّل یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو احکامِ خداوندی کا پابند بنا لیں اور "حدودِ مصطفےٰؐ" سے باہر قدم نہ رکھیں۔

باز اے آزادِ دستورِ قدیم — زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم
شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو — از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو

مرحلۂ دوم: ضبطِ نفس

خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ حکم برداری اور فرماں پذیری کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے

---

* ع باطنِ ہر شے ز آئینے قوی

میں انسان کی مثال اس سپاہی کی طرح ہے جس کا کام فقط حکم کی بجا آوری ہو۔ حکم کی حکمتوں اور مصلحتوں پر سوال کرنا یا ان کا جان لینا اس کے فرائض میں داخل نہیں۔ اُس کا فرض تو بس یہ ہے کہ وہ حکم پاتے ہی اس کی تعمیل میں لگ جائے اور زندگی و موت سے بے پرواہ ہو کر اس کو انجام دے۔ اس خالص عمل کے مقابلے میں دوسرا مرحلہ عمل کے ساتھ شعور و نظر کو بھی شامل کرتا ہے۔ یہاں انسان احکام کی لفظی اور مادی تعمیل کے ساتھ ساتھ ان کی حکمتوں اور حقیقتوں سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور اپنے نفس کی پوشیدہ اور گہری خصوصیات سے مطلع ہو کر اس کی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال نے اس کو ضبطِ نفس کا جامع نام دیا ہے۔ حقیقتاً یہ آئین و نفس کے باہمی ربط کو پا جانے کا مرحلہ ہے جسے خود شناسی اور خدا شناسی کا دیباچہ کہنا چاہیئے۔

ابتدا میں اقبال انسان کے عناصرِ ترکیبی (نفسی ساخت) کا ایک تصور پیش کرتے ہیں:*
مشیت ایزدی نے جب انسان کو بنایا تو اس کی خاک میں خوف و محبت کے جذبات کی آمیزش کردی۔ یہ جذبات بڑے شدید اور انسانی زندگی میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے بیشمار پہلو ہیں۔ خوف کے جذبے میں خوفِ دنیا، خوفِ آخرت، خوفِ جان، اور طرح طرح کے دوسرے غم و الم شامل ہیں۔ محبت میں مال و دولت کی محبت، زن و اولاد کی محبت، رشتہ و قرابت کی محبت، وطن و ملک کی محبت شامل ہے۔ خوف و محبت کی یہ گوناگونی، اگر اس کی مناسب تہذیب و تربیت نہ کی جائے تو انسانی شخصیت کے استحکام میں زبردست رکاوٹ بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر مال و دولت کی محبت انسان کو پرلے درجے کا حریص اور سنگدل بنا دیتی ہے، زن و اولاد سے بڑھا ہوا تعلقِ خاطر انسان کو بزدل اور کم ہمت بنا سکتا ہے۔ اسی طرح دنیا یا آخرت کا خوف قلب و نظر کا ایک ایسا روگ ہے کہ اس کی موجودگی میں

---

* "اسرار" : ۴۶، ۴۷

روحانی یا اخلاقی صحت و ترقی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خوف و محبت کے ان جذبات کی زہرناکی کا علاج کیا ہے؟ ہم کس طرح ان جذبات کی بے اعتدالیوں کو اعتدال میں اور سرکشیوں کو ضبط و قابو میں رکھ سکتے ہیں؟ اقبال کے نزدیک توحید اس کا علاج ہے۔ توحید کے معنے محض زبان سے ایک خدا کے وجود کا اقرار کرنا یا اس کی بادشاہت اور حاکمیت کو تسلیم کرنا نہیں۔ اقبال توحید کے اقرار کے نہیں اس کے اثبات کے قائل ہیں۔ کسی انسان کے اندر اصولِ توحید کے راسخ ہو جانے کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے دل میں خوف و محبت کی تمام ادنیٰ اور مضرت رساں صورتیں محو ہو چکی ہوں۔ توحید وہ قوت ہے جو ہم کو حیوانی جبلّت پر غلبہ و تسلط بخشتی ہے۔ اس کی بدولت ہم اپنی فطرت کے ادنیٰ تقاضوں کا غلام بن کر رہنے کی بجائے ان پر حاکم بن کر رہتے ہیں۔ خوف کا فطری جذبہ ہم کو قوت سے مرعوب ہونا سکھاتا ہے۔ مگر توحید کا پرستار باطل کی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے بھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ محبت کے ادنیٰ تقاضے نصب العین کی خاطر جان و مال اور زن و اولاد کی قربانی سے باز رکھتے ہیں۔ مگر توحید پرست کی فطرت کا جوہر ابراہیمی ہے جو نصب العین کی خاطر بیٹے کی گردن پر بھی چھری رکھ سکتا ہے الغرض توحید محض عقیدہ کا نام نہیں بلکہ وہ حقیقت عملی ہے جو عملاً انسان کو بے خوف بلند حوصلہ، وسیع نظر اور ایثار پیشہ بناتی ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت صدیوں سے اسلام کے پانچ 'ارکان' مانتی چلی آئی ہے۔ اوّل: کلمۂ توحید، دوم: نماز، سوم: روزہ، چہارم: حج، پنجم: زکوٰۃ۔ 'اسرار' کے زیرِ نظر حصہ میں اقبال نے دراصل یا نہی ارکانِ اسلام کی حکمت بیان کی ہے۔ اوپر جو کچھ مذکور ہوا ہے، وہ اصولِ توحید یا کلمۂ طیبہ کی حقیقت کا بیان تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دو دو شعر نماز، حج اور زکوٰۃ پر اور ایک شعر روزہ کی حکمت پر لکھا ہے۔ اصولِ توحید پر چھ شعر ہیں۔ ذیل میں ہم

اِن ارکانِ اسلام کے متعلق اقبال کے خیالات کو ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔

(۱) کہتے ہیں اگر تمہارے ہاتھ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا عصا ہے تو تم ہر خوف پر غالب آ سکتے ہو۔ جس شخص کے دل میں توحید اس طرح موجود ہو جس طرح جسم کے اندر روح، اس کی گردن باطل کے سامنے ہرگز نہیں جُھک سکتی۔ خوف توحید پرست کے سینہ میں راہ نہیں پا سکتا۔ اس کا دل سوائے خدا کے کسی طاقت سے مرعوب نہیں سکتا۔ جو کوئی لا الٰہ کی اقلیم میں آباد ہُوا وہ زن و اولاد کی بے جا بندش سے بھی آزاد ہُوا۔ وہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ وہ بیٹے کے حلق پر چھُری رکھ سکتا ہے۔ وہ تنِ تنہا بھی پوری سپاہ کے برابر ہے۔ جان اس کی نظر میں ہوا سے زیادہ ارزاں اور کم قیمت ہے:

تا عصائے لا الٰہ داری بدست — ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش — خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست — خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

ہر کہ در اقلیمِ لَا آباد شد — فارغ از بندِ زن و اولاد شد

می کند از ماسوا قطعِ نظر — می نہد ساطور بر حلقِ پسر

با یکے مثلِ ہجومِ لشکر است — جاں بچشمِ او زِ باد ارزاں تر است

(۲) قرآنِ حکیم میں ایک جگہ نماز کی حکمت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ یہ بے حیائی کی باتوں سے اور فسق و فجور سے روکنے والی ہے۔ احادیث میں نماز کی بے شمار فضیلتیں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ خلوصِ نیت اور حضورِ قلب سے ادا کرنے والے کے لئے نماز حجِ اصغر کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال نے انہی دو خیالات پر اپنے اشعار کی بنیاد رکھی ہے۔ کہتے ہیں لا الٰہ صدف ہے اور نماز اس کا گوہر ہے۔ اس سے قلبِ مسلم کو حجِ اصغر نصیب ہوتا ہے۔ نماز مسلمان

کے ہاتھ میں مثل ایک خنجر کے ہے جو فحاشی اور فسق و فجور کی قاتل ہے:

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز　　قلبِ مسلم را حج اصغر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است　　قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

(۳) انسان فطرتاً تن پرور اور کام و دہن کی لذّت کا شیدائی ہے۔ اپنی بھوک اور پیاس بجھانے کی فکر اور لذّت میں وہ دوسروں کی ضروریات سے بے پرواہ اور غافل ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف خود غرضی بڑھتی ہے اور دوسری طرف شکم پروری۔ انسان بھوک اور پیاس پر غالب آنے کی بجائے ان سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اس کی بڑھی ہوئی لذّت کوشی اس کے دل سے دوسروں کی ضرورت کا احساس مٹا دیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک روزہ اس ناپسندیدہ صورت حالات پر قابو پانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ بھوک اور پیاس پر شبخوں مارتا ہے، اور تن پروری کے قلعے کو مسمار کرتا ہے:

روزہ بر جوع و عطش شب خوں زند　　خیبرِ تن پروری را بشکند

(۴) حج ایک ایسا فریضہ ہے جس سے جذبات کی ایک خاص تہذیب مقصود ہے۔ آج سے چار ہزار سال پہلے تاریخ انسانی کے ایک عظیم موحدؑ نے اپنے فدائی توحید فرزند کی مدد سے مکہ میں ایک عبادت گاہ تعمیر کی تاکہ دور و نزدیک کے توحید پرست ہر قسم کی صنم پرستی سے منہ موڑ کر وہاں اکٹھے ہوں اور خدائے واحد کے سامنے سجدۂ عبودیت بجا لائیں۔ اس تعمیر کو جسے بعد میں کعبہ کا نام دیا گیا، غیر معمولی تاریخی اہمیت حاصل ہے لیکن قرآن نے تاریخی پہلو پر کم اور اس کے ثقافتی اور جذباتی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ جو لوگ مذہبی نفسیات سے واقف ہیں، وہ بخوبی اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کی زیارت ایک حساس طبع مسلمان میں کیسے گہرے اور پاکیزہ جذبات پیدا کر سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس پاکیزگی جذبات کو حج کا مقصودِ اوّل

قرار دیا ہے البتہ اس کے ساتھ امن و سلامتی اور دنیوی خیر و برکت کے 'منافع' کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

اقبال نے حج کے تین پہلو بیان کئے ہیں۔ ایک وہی جسے ہم نے ابھی مقصودِ اوّل کہا ہے اقبال نے اسے یوں بیان کیا ہے کہ حج مومنوں کے لئے 'فطرت افروز' ہے۔ باقی دونوں پہلو کم و بیش 'سیاسی' نوعیت رکھتے ہیں۔ اقبال زمانۂ حال کے نظریۂ وطنیت کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے۔ اس لئے انہیں حج میں 'ہجرت آموزی' اور 'وطن سوزی' کا پہلو نمایاں طور پر نظر آیا۔ بہ حیثیت مسلمان جب ہم خانۂ کعبہ کو اپنے دل میں سب سے زیادہ عزیز رکھیں گے تو ظاہر ہے کہ اپنے وطن کی خاک ایک طرح سے ثانوی حیثیت اختیار کرے گی اور ہم میں وطن پرستی کا وہ جذبہ کبھی پیدا نہ ہوگا۔ جو اقبال کے نزدیک نسلِ انسانی کے اتحاد میں آج سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اقبال حکمتِ حج کے اس پہلو پر زیادہ زور دیتے معلوم ہوتے ہیں۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ حج ایک ایسی عبادت ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے لئے 'سرمایۂ جمعیت' ہے۔ اس کی بدولت مختلف ملکوں اور نسلوں کے مسلمانوں میں وحدت کا رشتہ قائم ہے:

مومناں را فطرت افروز است حج   ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایۂ جمعیتے   ربطِ اوراق کتابِ ملّتے

(۵) نماز کے بعد جس فریضے پر قرآنِ حکیم نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ و انفاق کے ضمن میں قرآن حکیم میں متعدد آیات بڑی پُر حکمت اور معنویت سے لبریز ہیں۔ ان میں سے دو کا ذکر یہاں موقعہ و محل کی نسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے ایک آیت میں کہا گیا ہے:

تم نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک اپنے	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا
مال کو جو تمہیں بہت عزیز ہے خدا کی راہ	مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۞ (آلِ عمران : ۹۲)
(بہبودِ عامہ) میں خرچ نہ کرو گے۔	

دوسری میں فرمایا :

اے رسول! لوگ تم سے پوچھتے ہیں	يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ط
کہ وہ کیا خرچ کریں۔ ان سے کہو اپنی ضروریات	قُلِ الْعَفْوَ ط (البقرہ : ۲۱۹)
سے جو کچھ زائد ہو (اسے راہِ خدا میں فراخدلی	
سے خرچ کرو۔)	

قرآنِ حکیم کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں مختلف ذہنوں اور مختلف زمانوں کے لئے رہنمائی اور ہدایت کی وسعت موجود ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا۔ کہ اوپر کی دو آیات دو مختلف زمانوں کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔ پہلی آیت میں اگرچہ نیکی کو انفاق کے ساتھ ملزوم قرار دیا ہے۔ لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھائی گئی۔ بس ایک پُرزور ترغیب مال کو راہِ خدا اور فلاحِ عامہ میں خرچ کرنے کی اس سے ملتی ہے۔ مگر دوسری آیت میں واضح طور سے ایک ویلفیئر سوسائٹی کی روح پائی جاتی ہے۔ 'اسرار' کے زمانے تک اقبال کی نگاہ پہلی قسم کی آیات تک محدود تھی۔ چنانچہ وہ زیرِ نظر باب میں 'تُنْفِقُوْا' سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر آگے چل کر وہ 'قُلِ الْعَفْوَ' کی حکمت قرآنی کو بطورِ خاص پیش کرتے رہے*۔ زیرِ مطالعہ حصے میں وہ زکوٰۃ کی حکمت یوں بیان کرتے ہیں کہ اس سے دولت کی محبت مٹ جاتی ہے اور سوسائٹی میں مساوات کا جذبہ اُبھرتا ہے۔ زکوٰۃ دلوں کو قوت بخشتی ہے۔

---

* 'ضربِ کلیم' : ۱۳۸ 'پس چہ باید کرد' :

اچھے کاموں میں خرچ کرنے سے دولت بڑھتی ہے مگر دولت کی محبت نہیں بڑھتی :

حبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ　　　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حَتّٰی تُنْفِقُوْا محکم کند　　　　زر فزائد الفتِ زر کم کند

مرحلۂ سوم : نیابتِ الٰہی

اطاعت اور ضبطِ نفس جیسے الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سیرت سازی کا کوئی صوفیانہ دستور پیش کر رہے ہیں جسکی بدولت انسانی کردار میں ایک خاص نوع کی ہمواری اور استواری آجاتی ہے اور اس کو اختیار کرنیوالا بہت سی اخلاقی کمزوریوں سے پاک ہو کر پارسائی اور نیکی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اقبال کا مقصد صرف یہ نہیں۔ ان کے پیش کردہ نظامِ ضبط و اطاعت کا مقصود فقط زاہدانہ قسم کی پارسائی پیدا کرنا نہیں بلکہ ایسی زوردار اور انقلاب آفریں شخصیتوں کی تربیت کرنا ہے۔ جن کی عملی قوت اور تخلیقی جوش انسانی تمدن کی کایا پلٹ دے اور اس کے اندر فتنہ و شر کے جسقدر عوامل کارفرما ہوں، ان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکے۔ اقبال کا انسانِ کامل جسے وہ 'اسرار' کے زیرِ نظر باب میں 'نائبِ حق' کہتے ہیں اجتماعی خیر و قوت کا عظیم سرچشمہ ہے۔ وہ مردہ دلوں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکتا ہے۔ وہ غلاموں کو آزاد زندگی پر ابھارتا ہے اور ان کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلاتا ہے۔ وہ جنگ اور نفرت کے شعلوں پر صلح و آشتی کے بادل برساتا اور دلوں کی کھیتیوں میں محبت اور تعاون کے بیج بوتا ہے۔ وہ رنگ و نسل کے امتیازات مٹا کر اور معیشت کی ناانصافیوں کا قلع قمع کر کے انسانی معاشرے کے لئے عدل و مساوات کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ غرض اقبال کا مطلوب انسان دنیا سے بے تعلق قسم کا کوئی خانقاہی زاہد نہیں بلکہ جدید انداز کا انقلابی رہنما ہے جو انسانوں کے

تمدنی اور سیاسی مسائل میں جان کھپاتا اور اپنی غیر معمولی بصیرت اور جوشِ کردار سے ان کو حل کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے ارتقا میں فطرت کا مددگار رہے۔

'اسرار' کے زیرِ نظر حصے میں اقبال نے اس موضوع پر کوئی ۳۶ کے قریب اشعار لکھے ہیں جن کو بآسانی تین حصوں میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدا کے چند اشعار کو انسانیت کے اس اعلیٰ مرتبے کا تعارف سمجھنا چاہیئے۔ ان میں اقبال کہتے ہیں کہ جو شخص نفس کی سرکش قوتوں پر قابو پاتا ہے وہ زمین پر خدا کا نائب ہے اور جہانداری اسکا حق ہے۔ تاجِ سلیمانی اس کو زیب دیتا ہے وہ جملہ عناصر پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کی ذات کو دنیا میں ایسا اختیار و تصرف حاصل ہوتا ہے جس پر زوال نہیں۔ ایسا انسان دنیا کی جانُ آبرو ہے۔ اس کی قوتِ ارادی کے سامنے کوئی عقدہ لاینحل نہیں:

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است — بر عناصر حکمراں بودن خوش است

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است — ہستیٔ اُو ظلِ اسمِ اعظم است

دوسرے حصے میں 'نائبِ حق' کے اوصاف و خصائص پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے کردار کے اہم پہلو بیان کئے ہیں۔ نائبِ حق کی سیرت میں علم و حکمت، تخلیقی ولولہ اور انقلاب آفرینی بطورِ خاص نمایاں ہے۔ اس کی بصیرت اور اس کا جذبۂ خیر اس کے اندر تخلیق و انقلاب کی بے پناہ قوت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ پرانی دنیا اور فرسودہ نظاموں کو تہ و بالا کر کے اپنے ذوقِ عمل سے نئی دنیا میں تعمیر کرتا ہے* اس کی زبان میں وہ تاثیر اور اس کی نظر میں وہ جادو ہے کہ اس کے اثر سے بوڑھے جوان اور مردہ دل زندگی کی کیفیتوں

---

* خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند — ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

صد جہاں مثلِ جہانِ جز و کل — روید از کشتِ خیالِ او چو گل

سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ اسکی آواز دمِ عیسیٰ کا حکم رکھتی ہے:

شیب را آموزد آہنگِ شباب　　　می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

از قمِ اُو خیزد اندر گورِ تن　　　مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

وہ زندگی اور معاشرت کی مروجہ قدروں کا کڑی نظر سے جائزہ لیتا ہے اور تھکی ماندی انسانیت کو نئی منزلوں، نئی قدروں (VALUES) سے آشنا کرتا ہے۔ اس کا وجود زندگی کے لئے تازہ ممکنات کا پیغام ہے:

زندگی را می کند تفسیرِ نو　　　می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو

ہستیٔ مکنونِ او رازِ حیات　　　نغمۂ نشنیدۂ سازِ حیات

اس کا علم وسیع*، اس کی بصیرت گہری اور اس کی ہیبت دریاؤں کو خشک کر دینے والی ہے**۔ اس کے دم قدم سے ذرّے 'خورشید آشنا' ہوتے ہیں اور ہر زندہ چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے:

ذرّہ خورشید آشنا از سایہ اش　　　قیمتِ ہستی گراں از مایہ اش

مختصر یہ کہ محکم سیرت کا یہ انسان، یہ مردِ حق آگاہ، زمین پر خدا کا یہ نائب دنیا کے لئے ہزار خیر و برکت کا باعث ہے۔ وہ زندگی کے قافلے کا سچا رہبر ہے۔ اس کی بدولت فطرت کے بگڑے کاج سنورتے ہیں اور انسانوں کی زندگی میں نیکی، قوّت اور محبت کے

---

* ع از رموزِ جزو و کل آگہ بود

** ع خشک سازد ہیبتِ او نیل را

اس خیال کو ایک اور جگہ یوں بھی بیان کیا ہے:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

چشمے ابلتے ہیں۔ اقبال نے تربیتِ خودی کا جو اصول و دستور پیش کیا ہے اس کا مقصود کاروانِ حیات کے لئے ایسے ہی سالار پیدا کرنا ہے۔

مستقبل کی کوکھ سے پیدا ہونے والے ان انسانوں کے لئے اقبال چشم براہ ہے۔ زیرِ نظر اشعار کے آخری حصے میں انہوں نے جس جوش و عقیدت کے ساتھ ایسے انسانوں، ایسے رہنماؤں کا خیر مقدم کیا ہے، دنیائے شاعری میں اس کی نظیریں کم ملتی ہیں۔ وہ مستقبل کے اس تقدیر ساز انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

اے امکان دار تقاو کی آنکھ کے تارے اور اے تقدیر کا رُخ بدلنے والے، آؤ اور ہمارے دل و نظر میں سما جاؤ۔ اور ہماری دنیا کی زینت بنو۔ قوموں کی رہوری میں باہمی نفرت و عداوت کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ تم آؤ اور اس آگ کو ٹھنڈا کرو۔ تمہارے آنے ہی سے اخوت کا ساز چھڑے گا اور محبت کی شراب بٹے گی۔ آؤ اور آپس میں لڑنے والوں کو صلح و آشتی کا پیغام سناؤ۔ تمہاری بدولت ہی دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا	اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو	در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن	نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ	جامِ صہبائے محبت باز دہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح	جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

نوعِ انساں کھیتی ہے اور تم اس کا حاصل ہو۔ تم کاروانِ حیات کی منزل مقصود ہو۔ خزاں کی دست برد نے چمنِ عالم کو ویران کر دیا ہے، تم اس کے لئے موسمِ بہار بن کر آؤ۔ تمہارے بغیر دنیا کے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ جن کو ہم سرانجام نہ دے سکے۔

لہٰذا جب تم آؤ گے تو ہمارے بچے اور جوان اور بوڑھے بھی اپنی شرمسار پیشانیوں کے ساتھ تمہارے سامنے سجدۂ تعظیم بجا لائیں گے :

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی   کاروانِ زندگی را منزلی
ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر   چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر
سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر   از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

باب ۶

حکایاتِ ’اسرار‘

حکایت کے پیرائے میں زندگی کے حقائق و معارف کا بیان سعدی، عطار اور رومی کی بہترین روایات میں سے ہے جس کی طرف بہ حیثیت مجموعی اقبال نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی البتہ ’اسرار‘ میں اس مقبول اور دلنشیں اسلوب سے کچھ کام لیا ہے۔ تربیتِ خودی کے مرحلوں پر روشنی ڈالنے کے بعد انہوں نے اپنے نقطۂ خیال کی مزید وضاحت کے لئے چند حکایات بیان کی ہیں۔

دشمنوں سے خوفزدہ نوجوان

ان میں سے پہلی کا موضوع دشمنوں کے درمیان زندگی گزارنا ہے*۔ ایک نوجوان شہر مرو سے حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش لاہور) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے ”میرے دشمن قوی ہیں اور میں ان کے درمیان اس طرح گھرا ہوا ہوں جیسے پتھروں کے درمیان شیشہ۔ جنابِ والا! کوئی ایسا گر بتائیں کہ مجھے ان سے چھٹکارا حاصل ہو——“

علی ہجویری نے فرمایا:

تمہیں اپنی قوت کا احساس نہیں۔ ورنہ تمہارے دل میں دوسروں کا خوف کبھی گھر

* ’زندگی کردن میانِ دشمناں‘

ذکر تا۔ پتھر اگر اپنے آپ کو شیشہ خیال کرے تو وہ شیشہ کی طرح نازک ہو کر ٹوٹنے لگتا ہے۔ جو مسافر اپنے آپ کو کمزور و ناتواں سمجھتا ہے وہ اپنا سب کچھ راہزنوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تم کب تک اپنے آپ کو آب و گل کی ایک حقیر آمیزش سمجھتے رہو گے اور کب اپنی خاک سے شعلۂ طور پیدا کرو گے۔ اے عزیز! دشمنوں کا خوف و ہراس دل سے نکال دو اور اپنی خوابیدہ قوت کو بیدار کرو٭ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ دشمن کا وجود فضلِ الٰہی ہے کہ اس کے بغیر انسان کے اندر ہمت و حمیت کا جوش پیدا نہیں ہوتا۔ یاد رکھو دشمن انسان کی کھیتی کے لئے ابرِ رحمت ہے جو اس کے ممکنات کو خواب سے بیدار کرتا ہے۔

کشتِ انساں را عدو باشد سحاب ممکناتش را بر انگیزد ز خواب

اگر تجھ میں ہمت ہے تو تیرے سامنے پہاڑ بھی رائی بن جائے گا۔ اگر تم نے اپنی خودی کو محکم بنا لیا تو تم ساری دنیا کو ہلا سکتے ہو۔ جان لو کہ موت کا راز اپنے آپ سے بیگانہ رہنے میں اور زندگی کا راز اپنے آپ کو پا لینے میں مضمر ہے:

خویش را چوں از خودی محکم کنی تو اگر خواہی جہاں برہم کنی
گر فنا خواہی ز خود آزاد شو گر بقا خواہی بخود آباد شو

پیاسا پرندہ

دوسری حکائت کا سبق یہ ہے کہ جو چیز اپنی ذات میں محکم نہیں ہوتی وہ دوسروں کی ہوس اور ضرورت کی نذر ہو جاتی ہے۔ ایک پرندہ پیاس سے بے حال ہو رہا تھا۔ دور باغ کے ایک کونے میں اسے الماس کا ایک ریزہ دکھائی دیا۔ پیاس کی شدت میں سمجھا، کہ پانی چمک رہا ہے۔ جھٹ اڑا اور وہاں پہنچتے ہی اپنی چونچ اس پر ماری۔ لیکن وہ تر نہ ہوئی۔

٭ فارغ از اندیشۂ اغیار شو قوتِ خوابیدۂ، بیدار شو

بھلا الماس میں نمی کہاں! پرندے کی یہ نادانی دیکھ کر الماس بولا۔: او نادان! تم نے مجھے اپنی ہوس کا شکار کرنا چاہا مگر یہ نہ جانا کہ میں کیا ہوں۔ میں پانی نہیں کہ کوئی گھونٹ بھرلے۔ میری آب سے تو پرندوں کی چونچ ٹوٹ جاتی ہے اور انسان نگلنا چاہے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تیری نظر کو دھوکا ہوا ہے۔ میں نہ قطرۂ آب ہوں اور نہ ساقی۔ میں دوسروں کے لئے جینے کی منزل سے گزر چکا ہوں:

قطرۂ آبے نیم ساقی نیم   من برائے دیگراں باقی نیم

پرندے کو سخت مایوسی اور شرمندگی ہوئی۔ اُدھر پیاس سے اُس کی جان لبوں پر آرہی تھی۔ اتنے میں اس کی نظر شاخِ گل پر چمکتے ہوئے ایک قطرۂ شبنم پر پڑی جو سورج کے خوف سے لرز رہا تھا۔ پرندہ اڑا اور دوسرے ہی لمحے وہ قطرہ اس کے حلق سے اُتر چکا تھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ قطرہ ہیرے کی طرح سخت اندام نہ تھا لہٰذا اپنی ہستی کو کھو بیٹھا مگر الماس اپنے مضبوط اور محکم وجود کے باعث محفوظ رہا۔ تو اگر اپنی بقا اور سلامتی چاہتا ہے تو ایک دم کے لئے بھی خودی کی حفاظت سے غافل نہ ہو اور شبنم بننے کی بجائے الماس بن کر جیو۔

غافل از حفظِ خودی یکدم مشو   ریزۂ الماس شو شبنم مشو!

ہیرا اور کوئلہ

تیسری حکایت کا لبِ لباب یہ ہے کہ سخت کوشی اور سخت گیری سے زندگی میں عظمت کی راہیں کھلتی ہیں۔ کان میں ایک روز کوئلے نے ہیرے سے کہا کہ ہم دونوں سلگتی ہیں۔ ایک ہی کان سے نکلتے اور ایک ہی معدن سے برآمد ہوتے ہیں۔ ہماری زندگی اور ہیئت وبود کی اصل ایک ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میری قیمت خاک سے بھی کم ہے اور تو تاجِ شہنشاہی میں جگہ پاتا ہے۔ میں اس غم میں گھلا جاتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں اور تیری

لازوال جلووں کی امین ہے۔ میری قسمت میں چولہوں میں دھکنا اور جل کر راکھ ہو جانا ہے مگر تیری قسمت میں قیصر و کسریٰ کی آنکھ کا نور ہونا اور دستۂ خنجر کی زینت بنتا ہے۔ میری ہستی دھوئیں کی ایک لہر اور بجھتی ہوئی چنگاری کا ایک منظر ہے مگر تیری ذات میں ستاروں کی درخشندگی اور آئینے کا دل چاک کرنے والا جمال ہے۔ ہیرے نے یہ سن کر جواب دیا: یہ سب پختگی کا کرشمہ ہے۔ پختگی کی بدولت خاکِ سیاہ نگینہ بنتی ہے اور اپنے ماحول سے کشمکش کی بدولت سنگِ خارا کی طرح مضبوط اور محکم ہوتی ہے۔ میرے جسم سے جو نور کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں اور میرا سینہ جلووں سے معمور ہے، اس کا باعث پختگی ہے۔ اور تو جو ذلیل و خوار ہے اور جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو اس کا سبب تیری ناپختگی اور نرم پیکری ہے۔

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے خوف و وسواس سے آزاد رہے تاکہ اس کی شخصیت کو پتھر کی مضبوطی اور الماس کی دلآویزی حاصل ہو۔ جو شخص اپنے اندر سخت کوشی اور سخت گیری پیدا کرے گا اسکی چمک سے دو عالم روشن ہوں گے:

فارغ از خوف و غم و وسواس باش پختہ مثلِ سنگ شو، الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

مختصر یہ کہ زندگی کی آبرو سختی اور پختگی میں ہے۔ ناپختگی کا نتیجہ ناکسی اور بے چارگی کے سوا کچھ نہیں:

در صلابت آبروئے زندگی است ناتوانی ناکسی ناپختگی است

حکائتِ شیخ و برہمن

اگلی حکائت میں دو نکتے بیان کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کے دھندوں سے نمٹنا انسان ہونے کی حیثیت سے ہمارا پہلا فرض ہے۔ وہ انسان ہی کیا جس کا فکر آسمان تک

پرواز کرے۔ لیکن زمین کے مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہو۔ اس خیال کو اقبال نے "ضربِ کلیم" میں یوں ادا کیا ہے:

اگر نہ سہل ہوں تم پر زمیں کے ہنگامے ۔۔۔ بُری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ افراد کی سیرت اس وقت تک پختہ نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی مخصوص ملی روایات کو اپنے اندر جذب نہ کر لیں۔ ہر قوم اور جماعت اپنی کچھ روایات ثقافت واخلاق کے اپنے کچھ معیار اور تصورات رکھتی ہے۔ قوم کے افراد کے لئے ان روایات کا احترام کرنا اور ان سے وابستہ رہنا تعمیرِ کردار کے لئے اشد ضروری ہے۔

اقبال کہتے ہیں بنارس میں ایک برہمن رہتا تھا جس کو زندگی اور موت کے سربستہ راز پا لینے کی بڑی جستجو تھی۔ وہ علم و فضل میں بڑا اونچا مرتبہ رکھتا تھا۔ اور اس کے اخلاق کی دور دور تک شہرت تھی۔ اس نے حکمت کے تمام دفتر کھنگال ڈالے اور عقل و دانش کے ہر کوچے کی سیر کی لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا اور اس کا جامِ طلب شرابِ معرفت سے خالی ہی رہا۔ آخر کار وہ ایک شیخ کامل کے آستانے پر حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں اپنی نامرادی کی شکایت کی۔ شیخ نے اس کا ماجرا سُن کر فرمایا:

زمین کے ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر تو نے آسمانوں پر پرواز کی اور فکر و تخیل کے زور سے زندگی کو سمجھنا چاہا۔ تمہارا پہلا ہی قدم غلط تھا۔ اگر تم زندگی کی حقیقت جاننا چاہتے ہو تو آسمان کی بلندیوں سے اتر آؤ اور زمین سے اپنا رشتہ قائم کرو۔ یاد رکھو یقین کی کمی اور تذبذب سامانِ زیست کے رہزن ہیں۔ اگر کافر ہو تو زنار کے شایانِ شان بنو، اگر مسلمان ہو تو ابراہیمؑ کا جوشِ ایمان دکھاؤ۔ جب تک سینہ میں احساسِ خودی کی شمع روشن نہ ہو گی فکر خواہ آسمان تک پرواز کرے، اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا:

مُردِ چوں شمعِ خودی اندر وجود
از خیالِ آسماں پیما چہ سود

مکالمۂ گنگا و ہمالہ

مذکورہ بالا حکایت کے ساتھ ہی اقبال گنگا و ہمالہ کے مابین ایک مکالمہ چھیڑ دیتے ہیں۔ ایک روز آبِ گنگا نے ہاتھ بڑھا کر کہسار کا دامن پکڑ لیا اور ہمالہ سے کہا: بے شک روزِ ازل سے تیرے سر پر برف کا تاج دھرا ہے اور دریا تیرے قدموں میں بل کھا کھا کر تیری عظمت گیت گاتے ہیں اور قدرت نے تجھے آسمان کا ہمراز بنایا ہے۔ مگر اس بلندی اور تمکین و وقار سے کیا حاصل جب کہ تیرے پاؤں میں چلنے کی سکت نہیں۔ زندگی چلنے اور مسلسل چلنے کا نام ہے اور تو اس لذت و نعمت سے محروم ہے۔ ہمالہ اس طعنے سے غضبناک ہو کر بولا:

تیرا خرامِ ناز تیری موت کا سامان ہے۔ جو کوئی اپنے مقام پر قائم نہیں رہ سکتا وہ فنا کے لائق ہے۔ تو اپنے بہاؤ اور خرام پر نازاں ہے، یہ محض تیری نادانی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ جب تم اپنی ہستی کو سمندر کی نذر کر دیتے ہو تو تم اُس نادان مسافر کی مانند ہو، جو اپنے آپ کو رہزنوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ میری طرف دیکھو، صدیاں بیت گئیں مگر میرے قدموں میں لغزش نہ آئی۔ جہاں تھا وہیں پر قائم و دائم ہوں۔ لیکن تم جب سمندر میں جا گرتے ہو تو تمہارا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ تم مجھے بے حاصلی کا طعنہ دیتے ہو اور یہ نہیں دیکھتے کہ ستارے میری چوٹیوں کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور ثریا میرے دامنِ عافیت میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ میں آسمانوں کے راز سے اور فرشتوں کی پرواز سے آشنا ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو سعیِ پیہم کی آگ میں جلایا اور میرے

اندلس و للاس پیدا ہوئے - یاد رکھو زندگی پانی کی طرح بہہ جانے میں نہیں، پہاڑ کی مانند خود کو قائم رکھنے میں ہے - باغِ ہستی میں پھول کی طرح خوددار بنو اور اپنی خوشبو پھیلانے کے لالچ میں گلچیں کے پیچھے مارے مارے مت پھرو - زندگی اپنی جگہ پر قائم رہ کر بڑھنے اور اپنی ذات کی پھلواڑی سے پھول چننے کا نام ہے:

ہمچو گل در گلستاں خوددار شو بہرِ تشہیرِ بو پئے گلچیں مرو
زندگی بر جائے خود بالیدن است از خیابانِ خودی گل چیدن است

باب ۷
جہادِ اسلامی کی غایت

خودی کے تصور میں اقبال نے قوت و صلابت پر جس قدر زور دیا ہے، اسے آپ دیکھ چکے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی آسانی سے پیدا ہو سکتی تھی (اور ایک طبقہ میں یہ غلط فہمی پیدا ہو کر رہی) کہ اقبال اندھی قوت کے قائل ہیں اور اس اعتبار سے ان کا فلسفہ دراصل سفاکی اور خونریزی کا ایک پیغام ہے۔

دوسری طرف غیر اسلامی دنیا اور بالخصوص یورپ میں جہادِ اسلامی کے متعلق پہلے ہی سے شدید غلط فہمیاں تھیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے یورپ میں یہ خیال گویا راسخ ہو چکا تھا کہ مسلمان ایک اجڈ اور وحشی قوم ہے جس کا مذہب انہیں لوٹ مار اور غارتگری کی تعلیم دیتا ہے اور ان کا اصولِ جہاد دنیا کی امن پسند قوموں کے خلاف ایک مستقل اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِن وجوہ کی بنا پر "میرا خیال ہے" اقبال نے "اسرار" کے آخر میں جہاد کے اسلامی تصور کی وضاحت ضروری خیال کی تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے اس اصول کی غرض و غایت اور خود ان کے پیغام کا منشا دوسروں پر غلبہ و تسلط یا کسی قسم کی حاکمیت قائم کرنا نہیں ہے۔ چنانچہ کتاب کے پندرھویں باب کا عنوان ہے: مسلمان کی زندگی کا

مقصود حق کا بول بالا کرنا ہے اور وہ جنگ جسکی تہ میں ملک گیری کی ہوس کارفرما ہو، دینِ اسلام میں حرام ہے*۔ لیکن اقبال نے مسئلۂ جہاد پر یہاں کوئی اصولی یا تفصیلی بحث نہیں کی بلکہ اپنے خیال کو بیشتر ایک تاریخی واقعہ کی مدد سے بیان کیا ہے۔

جہاد کی حدود

فرماتے ہیں جب شاہجہان نے اپنی سلطنت کے حدود بڑھانے اور اپنے حلقۂ اقتدار وسیع کرنے کی غرض سے دکن میں لشکر کشی کی اور وہاں کی مسلمان ریاستوں نے شاہی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ شروع کیا تو ایک روز شاہ جہان اُس عہد کے مشہور خدا رسیدہ بزرگ حضرت میاں میر (لاہوری) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حاضری کا مقصد یہ تھا کہ حضرت موصوف شاہی افواج کی فتح ونصرت کے لئے دعا فرمائیں۔ بادشاہ کی عرضداشت سننے پر حضرت میاں میر بدستور خاموش بیٹھے رہے۔ اس پر محفل ہمہ تن انتظار بن گئی کہ دیکھیں شہنشاہ کے جواب میں درویشِ خدامست کیا کہتے ہیں۔ اتنے میں حضرت موصوف کا ایک عقیدتمند حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کی "پیرو مرشد! میں نے بڑی محنت وجانکاہی سے یہ درہم کمایا ہے تاکہ آپ کی خدمت میں اسے بطور نذرانہ کے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرسکوں۔ اسے قبول کرکے نیازمند کی ایک دیرینہ آرزو پوری ہونے کا موقع عنایت فرمایئے۔"

اس پر حضرت میاں میر نے فرمایا: اس سکہ پر ہمارے سلطان کا حق ہے کیونکہ اس کے شاہی لباس کے اندر ایک فقیر چھپا ہوا ہے۔ وہ بظاہر ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے مگر حقیقت میں ایک مفلس ترین انسان ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی نظریں دوسروں

---

* در بیانِ این کہ مقصدِ حیاتِ مسلم اعلائے کلمۃ اللہ است وجہاد اگر محرکِ آں جوع الارض باشد در مذہب اسلام حرام است۔

کے مال و دولت پر کیوں لگی رہتیں اور اس کی بھوک کے شعلے ایک جہان کو جلانے پر کیوں آمادہ رہتے ؟" آپ نے مزید فرمایا،" شہنشاہ کے افلاس نے اس کی تلوار پیدا کی ہے۔ جس کے سایہ میں قحط اور طاعون پھیلتے ہیں اور اسکی سطوت اہلِ دنیا کے لئے وبالِ جان ہے :

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است   نوعِ انساں کارواں، او رہزن است

اقبال نے حضرت میاں میر کی اس بے باک گفتگو کا نتیجہ یا بادشاہ پر اس کا ردِ عمل بیان نہیں کیا۔ انہوں نے اس باب کو حضرت موصوف کے اعلانِ حق پر ہی ختم کر دیا ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ جہاد فقط حق و انصاف کے نام پر تلوار اٹھانے کا نام ہے۔ ہوس و اقتدار کی جنگ خواہ اس کا مورد و محل بظاہر کچھ ہی ہو، جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

چند اشعار

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے اقبال نے جہاد کے مسئلے سے یہاں کوئی اصولی بحث نہیں کی البتہ اس باب کے شروع اور آخر میں چند اشعار ایسے ضرور کہے ہیں جن کا مطالعہ کئے بغیر آگے بڑھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی مسلمان کے دستورِ زندگی کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے کہ "میری عبادت، میری قربانی میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العالمین کے لئے ہے"* اقبال نے اس تصور کے بیان سے زیرِ نظر باب کا آغاز کیا ہے۔ مسلمان خدا کا سچا عاشق اور اس کا رضا جو ہے۔ اگر مسلمان میں یہ بات نہیں، اگر اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ذاتِ خداوندی کے

---

* قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۶: ۱۶۳)

سوادِ نیا دی شان و شوکت یا مال و منال تو وہ مسلمان نہیں کافر ہے۔* مسلمان وہ ہے جس کی زندگی، جس کی تمام تگ و دو اور جد و جہد باری تعالیٰ کی رضا و احکام کی تابع ہو۔ اس کا دیکھنا نہ دیکھنا، اس کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا اور سونا جاگنا ہر بات تابعِ فرمانِ الٰہی ہے:

تابعِ حق دیدنش نا دیدنش   خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

وہ اس ضابطے اور ڈسپلن میں اس قدر پختہ ہو جاتا ہے کہ خدا کی مرضی اس کی مرضی میں 'گم' ہو جاتی ہے ج

در رضائش مرضیٔ حق گم شود ؎

لہٰذا اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ کوئی سچا مسلمان کسی ایسی جنگ میں شریک ہوگا جسے تائیدِ ربانی اور جوازِ قرآنی حاصل نہ ہو۔

باب کے آخر میں جہاں حضرت میاں میر کی تقریر ختم ہوئی ہے اقبال ایسے تاجداروں اور تیغ زنوں کی نفسیات کو بے نقاب کرتے ہیں جنکی ہوس پرستی ان کو جنگ پر اکساتی ہے اور جس کے لئے وہ طرح طرح کے بہانے تراشتے اور نعرے ایجاد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جنگجوئی انسانیت اور مذہب کے خلاف بد ترین بغاوت ہے۔ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کو جہاد یا تسخیر کا نام دینے میں ان کے عمل کا گھناؤنا پن کم نہیں ہو سکتا۔ ایسے شاہوں کی بھوک دو دھاری تلوار ہے۔ جو ایک طرف دشمن کے ملک کو اور دوسری طرف اپنی سپاہ کو غرقِ ہلاکت کرتی ہے:

---

* طبعِ مسلم از محبت قاہر است   مسلم اگر عاشق نباشد کافر است

ج بالِ جبریل میں یہی خیال یوں ادا ہوا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ   غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

از خیال خود فریب و فکرِ خام　　می کند تاراج را تسخیر نام

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم　　ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دونیم

جنگجو سلطان گداگروں سے بدتر ہیں۔ گدا کی بھوک اسکی اپنی جان کو کھاتی ہے دقہر درویش برجانِ درویش)، مگر سلطان کی ہوس ہزاروں کی ہوس ہزاروں لاکھوں کے لئے موت کا پیغام بن سکتی ہے:

آتشِ جان گدا جوعِ گدا است　　جوعِ سلطاں ملک ملّت را فنا ست

لیکن ایسے لوگ قانونِ قدرت سے بچ نہیں سکتے۔ جو شخص حق و انصاف کے بغیر محض ملک گیری کی ہوس میں تلوار اٹھائے گا۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، اسکی تلوار خود اس کے سینے سے پار ہوگی:

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او آرمید

الغرض اقبال نے بڑے زور دار انداز میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حکومت و اقتدار، مال و دولت یا محض قتل و غارت کی خاطر جو لڑائی لڑی جائے گی وہ جہاد نہیں ہو سکتی۔ اسلامی اصطلاح میں فقط خدا اور نیکی کے راستے میں کوشش کرنے اور اس راہ میں جان لڑانے اور جان دینے کا نام جہاد ہے۔

باب ۸

وقت تلوار ہے

تمہید

وقت کی اہمیت سے کون واقف نہیں لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ وہ مسئلہ ہے جسے فلسفہ و تصوف کا مشکل ترین عقدہ کہنا چاہیئے۔ خود اقبال نے ایک فلسفی کا مقولہ اپنے خطبات میں نقل کیا ہے۔ آگسٹائن کہتا ہے: "اگر مجھ سے وقت کے متعلق سوال نہ کیا جائے تو میں اسے جانتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی سوال کر بیٹھے تو یقین جانئے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

اس وقت اور مشکل کے باوجود بہت سے دوسرے شہرۂ آفاق فلسفیوں کی طرح اقبال نے بھی وقت کی ماہیت اور انسانی زندگی میں اس کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھنے سمجھانے کی مخلصانہ اور مسلسل کوشش کی ہے۔ 'اسرارِ خودی'، 'پیغامِ مشرق'، 'زبورِ عجم'، 'بالِ جبریل'، 'جاوید نامہ' اور اپنے انگریزی خطبات میں انہوں نے مختلف موقعوں پر اور مختلف پیرایوں میں اس دقیق مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

بالِ جبریل کی مشہور نظم 'مسجدِ قرطبہ' کے پہلے بند میں 'سلسلۂ روز و شب' کے کتنے ہی اسرار نہایت فنکارانہ اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ دن رات کا نظام، یہ صبح و شام کی گردش، یہ وقت کا بہاؤ حادثات کا نقش گر ہے۔ واقعات اسکی کوکھ سے جنم لیتے، اور

ہی کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ لہٰذا زندگی اور موت کی اصل وقت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وقت کے دوران میں، انسان کی بقا کے ساتھ ہستی باری تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور تخلیق اعلیٰ کا اظہار کرتی ہے۔ گویا رات کی سیاہی اور دن کی روشنی دو رنگ کا ریشمی تار ہے جس سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے۔ میرے آپ کے اور زندگی کے تمام امکانات کا ظہور وقت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، نئے نئے حالات رونما ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ اپنے ساتھ زندگی کا نیا رنگ روپ لے کر آتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو تبدیلی اور ترقی رفتارِ وقت ہی کا دوسرا نام ہے۔ وقت صرف ترقی کا ہی داعی نہیں بلکہ مرورِ ایام اور گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ نکمی اور ناکارہ چیزیں صفحۂ ہستی سے مٹ رہی ہیں اور طاقتور و توانا، صحیح و صحت مند اشیاء آگے بڑھتی اور استحکام حاصل کرتی جاتی ہیں۔ گویا وقت اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے شاید یہ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ وقت نہ ہو، وقت آگے نہ بڑھے تو زندگی ایک مقام پر رک کر موت کے گھاٹ اتر جائے۔

بالِ جبریل ہی کی ایک اور نظم "زمانہ" ہے۔ یہ گویا وقت کی کہانی خود اس کی زبانی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ فنا آفریں ہاتھ سے وہی شے بچ سکتی ہے جس میں تخلیق وغیرہ کی استعداد بدرجۂ اتم موجود ہو۔ وقت کسی کی رو رعایت نہیں کرتا، جس کا عمل تعمیری ہے، جو ہر وقت صحیح کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، فروغ پاتا ہے۔ مگر جس میں یہ قابلیت نہیں ہوتی یا نہیں رہتی، جو جذبۂ تعمیر و تخلیق سے عاری ہوتا یا ہو جاتا ہے، وقت کا ریلا اس کی غیر مفید اور بے کار ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ نظم کے آخر میں اقبال نے مغربی تہذیب کے زوال کی پیشگوئی کی ہے۔ جس تہذیب نے زندگی کو جوا ری کا کھیل سمجھ رکھا ہو، جو ارتقائے حیات میں رکاوٹ بن رہی ہو، وقت اسے کیونکر معاف کر سکتا ہے!

ان احساس قسم کی دوسری نظموں کا لبِّ لباب یہ ہے کہ وقت یا وقت کا بہاؤ کوئی لایعنی اور بے اصل شے نہیں ہے بلکہ ایک زبردست مقصدی حرکت ہے جسکی غائت کا جاننا ہمارے لئے از بس ضروری ہے۔

(۲)

ان نظموں کے علاوہ اس موضوع پر اقبال نے دو جگہ قدرے تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک اپنے انگریزی خطبات میں جہاں وہ برگساں کے نظریۂ زمان اور مسلمان حکماء کے متعلقہ خیالات سے بحث کرتے ہیں۔ اور دوسرے اسرارِ خودی کے سترھویں باب میں جسے انہوں نے "الوقت سیفٌ" کا عنوان دیا ہے۔ یہاں ہم صرف "اسرار" کے زیرِ نظر باب کا مطالعہ کریں گے۔

تخلیقی قوت

اقبال اپنی گفتگو کا آغاز امام شافعیؒ کے ایک قول سے کرتے ہیں۔ جسمیں وقت کو تیغِ اصیل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں امام شافعیؒ نے کیسی پتہ کی بات، کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ وقت واقعی چمکتی ہوئی تیز تلوار ہے اور یہ تلوار جس شخص کے ہاتھ میں ہوگی زمانہ اسی کے پیچھے اور اسی کے قبضہ میں ہوگا۔ ایسے صاحبِ سیف کی قوت کی کیا پوچھتے ہو؟ موسیٰؑ کے ہاتھ میں یہی تلوار تو تھی۔ اسی کے بل پر انہوں نے فرعون سے ٹکر لی، چٹانوں سے چشمے بہائے اور دریاؤں کو خشک کر ڈالا! حضرت علیؓ اسی تلوار کے زور سے خیبر شکن کہلائے۔

یہ تلوار میرے آپ کے ہاتھ میں کیونکر آسکتی ہے؟ اس کی شرطِ اول یہ ہے کہ ہم وقت کی حقیقت کو جانتے ہوں، اور اس کے بارے میں کسی غلط فہمی، کسی توہم پرستی،

کسی لغزشِ فکر کے شکار نہ ہوں۔ جو لوگ وقت کو ایک سیدھی لکیر، ایک خطِ مستقیم خیال کرتے ہیں کہ جس پر قیامت تک کے واقعات درج ہیں اور اسے ماضی، حال اور مستقبل میں بانٹ کر اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھنے کے عادی ہیں، وہ وقت کی حقیقت اور اس کی تخلیقی قوتوں سے محرم نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو تقدیر پرستی کے مہلک مرض میں گرفتار ہوتے ہیں۔ وقت کے خط پر قیامت تک کا ایک ایک واقعہ، ایک ایک حادثہ، ایک ایک سانحہ پہلے سے ثبت اور پتھر پر لکیر نہیں کہ اس کی ناگزیری کے سامنے ہم، آپ اور خود زمانہ بے بس اور مجبور ہوں اور اپنی مرضی، اپنی کوشش اور اپنی آرزو کے مطابق کچھ بھی نہ کر سکیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ وقت کا ایک ظاہری اور طبیعی پہلو ہے جس کو ہم اپنی سہولت کے لئے ماضی، حال اور مستقبل یا صبح، شام اور دوپہر کا نام دیتے ہیں اور اس طرح اس کے تسلسل کو بانٹ کر اپنے معمولات کا تعین کرتے ہیں۔ یہ وقت کا ظاہر ہے جس سے اس کا باطن متاثر نہیں ہوتا۔ وقت کا باطن، انسان کے باطن کی طرح زبردست تخلیقی اور انقلابی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ وہی شخص رابطہ قائم کر سکتا ہے اور اس کی قوتوں سے کام لینے کے قابل ہوتا ہے جو پہلے اپنے باطن میں جھانکے اور اپنے اندرون کو قبضہ میں لائے۔ جو انسان اپنے من میں ڈوب کر زندگی کو جاننے اور اس کو مسخر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، وقت کی تخلیقی قوت اس کے ہاتھ کی تلوار بن جاتی ہے۔ پھر وہ شخص چاہے تو تاریخ کا رُخ بدل دے، واقعات کا دھارا پلٹ دے۔ اس کے عزم و عمل کے سامنے کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ اقبال نے وقت کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس کی بدولت انسان تقدیر پر قابو پا سکتا ہے۔ صاحبِ عزم و عمل انسان وقت کی قوت سے کام لے کر انفرادی اور اجتماعی تقدیر کی

صورت گری کرتا ہے۔ انسان تقدیر کے سامنے بے بس اور مجبورِ محض نہیں ہے۔ وقت کی تلوار ہاتھ میں لے کر وہ صاحب اختیار بن سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس خیال کی مختلف صورتیں ہیں:

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
کہ یاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

سطورِ بالا میں اقبال کے تصورِ وقت کے ایک اہم پہلو کی کسی قدر تشریح کر دی گئی ہے۔ پھر بھی زیرِ نظر باب کے ابتدائی حصے میں اقبال نے وقت کی جو پُرجوش تعریف کی ہے اور جس خوبصورتی کے ساتھ دو مشہور احادیث کو انہوں نے اپنے بیان میں سمویا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ قارئین کے سامنے اگر وہ سب اشعار نہیں تو ان کا انتخاب ضرور پیش کیا جائے:

تو کہ از اصلِ زماں آگہ نۂ — از حیاتِ جاوداں آگہ نۂ
تا کجا در روز و شب باشی اسیر — رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

لی مع اللہ وقت۔ اس حدیث میں رسول کریم نے فرمایا ہے: مجھے قرب الٰہی میں ایک ایسا وقت میسر ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت | زندگی سرّیست از اسرارِ وقت
اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست | وقت جاویداست و خور جاوید نیست
زندہ از عرفانِ اصلش زندہ تر | ہستیٔ او از سحر تابندہ تر
زندگی از دہر و دہر از زندگی
لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ٭ فرمانِ نبیؐ است

محکوم اور آزاد میں فرق

وقت کی ماہیت پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال محکوم اور آزاد میں فرق بیان کرتے ہیں۔ محکوم وہ نہیں جس کا جسم و جان کمزور ہے یا جس نے علم کم سیکھا ہے یا دولت زیادہ نہیں کمائی۔ محکوم دراصل وہ ہے جو وقت کے ہاتھوں پٹ گیا اور آزاد وہ ہے جو وقت کی قوتوں سے نبرد آزما ہو کر ان پر غالب آیا۔ محکوم گردشِ لیل و نہار میں سرگرداں ہے مگر آزاد؟ آزاد کے سامنے سارا عالم سرگرداں ہے اور اس کے اشارے پر گردش کرتا ہے۔٭٭ محکوم دامِ صبح و شام میں صیدِ زبوں ہے جو دم مارنے کی مجال نہیں رکھتا لیکن آزاد کا سینہ خود ایک قفس ہے جس میں طائرِ دوراں گرفتار ہوتا ہے۔ غلام کے لئے سلسلۂ ایام بس ایک زنجیر ہے جس میں وہ جکڑا ہوا تقدیر کا رونا روتا ہے مگر آزاد کی ہمت قضا کی مشیر اور رازدان ہوتی ہے اور اس کے ہاتھ سے حادثات صورت پذیر ہوتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ آزاد ہاتھ تو دستِ

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ایسا وقت بھی میسر آتا ہے جو کسی نبیٔ مرسل یا مقرب فرشتہ کو نصیب نہیں ہوا۔

اقبال اس سے زمان و مکان سے بالاتر ہونے کی حالت مراد لیتے ہیں۔

٭ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: دہر کو برا نہ کہو کیونکہ اللہ ہی دہر یعنی زمانہ ہے۔

٭٭ عبد گردد یاوہ در لیل و نہار | در دلِ حرؔ یاوہ گردد روزگار

قسمت کا کام کرتا ہے مگر محکوم حادثات کے سیلِ رواں میں خس وخاشاک کی طرح بے اثر ہوتا ہے؟
اقبال کا جواب یہ ہے کہ وقت شناسی کا تعلق انسانی قلب کی گہرائیوں سے ہے۔ جو شخص
اپنے من میں ڈوب گیا، اس نے رازِ زندگی، حقیقتِ زماں کو پا لیا وہی کامیاب و کامران ہے:

عبد را ایامِ زنجیر است و بس | بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس
همتِ حُر با قضا گردد مشیر | حادثات از دستِ او صورت پذیر
نکتۂ غیب و حضور اندر دل است | رمزِ ایام و مرور اندر دل است

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

وقت کے متعلق بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ وہ گول دائرہ کی صورت میں حرکت
کرتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کا مقولہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔* یہ نظریہ بھی
ترقی وارتقاء کے راستے میں اسی طرح رکاوٹ بن سکتا ہے جس طرح یہ خیال کہ قیامت
تک کے واقعات وقت کی کتاب میں پہلے سے درج اور ثبت ہیں جنہیں مٹایا یا بدلا نہیں
جا سکتا۔ اقبال کہتے ہیں وقت کولہو کے بیل کی طرح چکر نہیں کاٹ رہا ہے کہ نسلِ آدم جہاں
سے چلی تھی ایک مقررہ مدت کے بعد پھر وہیں پہنچ جاتی ہے۔ وقت کی حرکت ارتقائی اور تخلیقی
ہے۔ وقت پیہم اور مسلسل آگے بڑھ رہا ہے اور اس کے عمل میں بے پناہ قدرت ہے۔
وہ تکرار پسند نہیں تو آفریں اور تازہ کار ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال نے وقت کا ایک صحت مند اور حقیقت پسندانہ تصور دے کر
ہمیں بے عملی، یاس پسندی اور تقدیر پرستی کی اس خوفناک دلدل سے نکلنے کی کوشش

---

* HISTORY REPEATS ITSELF

کی ہے جس میں ہم پھنس کر رہ گئے تھے اور جس کے باعث گذشتہ کئی سو سال ملتِ اسلامیہ پر انحطاط و ادبار کے گہرے بادل چھائے رہے۔ اقبال کے نزدیک وقت بھول بھلیاں یا فریبِ نگاہ نہیں، ایک ایسی سنگین حقیقت ہے جس کا مقصد ہمارے اندر عمل کا جوش اور تخلیق کا ولولہ پیدا کرنا ہے۔ وقت ہماری ہی خاطر ہم کو دعوتِ مبارزت دیتا ہے تاکہ اُس کا مقابلہ کر کے ہم اس کی قوتوں سے کام لیں۔ دوسرے لفظوں میں وقت اُس روایتی جن یا دیو کی طرح ہے جس کا عامل اگر اسے پوری طرح قابو میں رکھے تو وہ اس کی ہر خدمت بجالاتا ہے، اُس کا مطیع و فرمانبردار اور غلامِ بے دام ہے۔ لیکن اگر عامل اسے قابو میں نہ رکھ سکے تو جن اس کے لئے عبرتناک موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

حصّہ دوم
(مِلّت)

باب ۹
قوم کس طرح بنتی ہے

'اسرارِ خودی' ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے کوئی اڑھائی تین برس بعد ۱۹۱۸ء میں اقبال نے 'رموزِ بیخودی' شائع کی۔ جیسا کہ ان مثنویوں کے نام سے ظاہر ہے، 'اسرار' کا تعلق فرد اور اس کی انفرادی نشوونما اور ارتقاء سے ہے اور 'رموز' کا موضوع قومی اور اجتماعی خودی ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کی تکمیل یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن و قلب کی تمام صلاحیتوں کو ترقی دے کر ان کو اجتماعی خیر و بہبود کے لئے وقف کر دے، اور اس طرح اپنی تربیت یافتہ انفرادیت کو جماعت کے فروغ و استحکام کا باعث بنائے۔ جو فرد ایسا نہیں کرتا، جو اجتماعی مفاد کو پسِ پشت ڈالتا یا اس سے قطعِ نظر کرتا ہے اسکی خودی ناقص، نامکمل اور نامراد رہتی ہے۔

مذکورہ بالا خیال کو انہوں نے اپنی ایک مختصر اردو نظم میں بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے جس کا عنوان ہے: پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ۔ بعض افراد میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ قوم پر جب مصیبت آن پڑے، جب وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو تو بہادر اور ایثار پیشہ انسانوں کی طرح بُرے دنوں میں اس کا ساتھ دینے اور اس کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھنے کی بجائے وہ اس سے اپنا ناطہ توڑنے اور اس کی عام فضا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ایسے لوگ وقتی طور پر شاید کچھ فائدہ

اٹھا جائیں۔ لیکن انجام کار وہ بڑے خسارے اور گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ان کی مثال اس شاخ کی سی ہے جو موسمِ خزاں میں درخت سے کٹ جائے۔ خزاں کا دور گزر جانے پر جب فصلِ بہار آتی ہے تو درخت پھر سرسبز ہو جاتا ہے مگر وہ شاخ جو اس سے کٹ چکی ہے ناممکن ہے کہ اس پر کبھی بہار آئے۔ درخت سے الگ ہونے والی شاخ آئندہ آنے والی اَن گنت بہاروں سے بھی اپنے آپ کو الگ کر چکتی ہے۔ وہ بہار کی شادمانیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی حال خودغرض اور ملت فراموش افراد کا ہے۔ اچھے لوگ وہ ہیں جو مصیبت کے وقت جماعت کے کام آتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے دلی تعلق کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں۔ نظم یہ ہے :

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو ناآشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اقبال نے درخت و شاخ کی اسی تمثیل کو 'رموزِ بیخودی' کے پہلے باب میں بیان کیا ہے : وہ پتا جو اپنی شاخ سے گر کر الگ ہو جاتا ہے، بہار سے اس کا رشتۂ امید بھی ہمیشہ کے لئے کٹ جاتا ہے :

برگِ سبزے کز نہالِ خویش ریخت از بہاراں تارِ امیدش گسیخت

فرد و ملت کے باہمی ربط کو ظاہر کرنے کے لئے اقبال نے ایک اور تمثیل سے بھی کام لیا ہے۔ موج اپنے اندر پانی کی جو مقدار اور وزن رکھتی ہے، اُس وزن اور مقدار کا پانی دریا و سمندر سے باہر قطرہ کسی شان اور وقار کا حامل نہیں ہوتا۔ دو چار سو من پانی عام سطح زمین پر انتہائی بے وقعت شے ہے۔ اس میں کوئی تندی و تیزی، کوئی قوت اور زور پیدا نہیں ہو سکتا لیکن پانی کی یہی مقدار جب سمندر کے اندر موج بن کر ابھرتی ہے تو اس سے جہازوں کے دل دہلتے اور نہنگوں کے نشیمن تہ و بالا ہو تے ہیں۔ یہی صورت فرد کی ہے۔ جماعت سے وابستہ رہ کر اور ملت میں 'گم' ہو کر اس کی قوت بے اندازہ اور اس کا اثر و نفوذ بے پناہ ہوتا ہے لیکن قوم سے اپنا رشتہ توڑ کر اس کی ذات میں کوئی وقعت اور وقار باقی نہیں رہتا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

رابطۂ استوار

فرد اور جماعت کا یہی ربط، یہی 'رابطۂ استوار' رموزِ بیخودی کے پہلے باب کا موضوع ہے اور اسے اقبال نے طرح طرح سے قارئین کے دل میں اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ باب کا آغاز ہی اس زوردار شعر سے ہوتا ہے کہ جماعت کا تعلق فرد کے لئے رحمت ہے۔ کیونکہ اس وابستگی کی بدولت ہی اسکی فطرت کا جوہر کمال تک پہنچتا ہے:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است   جوہرِ او را کمال از ملت است

احادیث میں رسولِ اکرمؐ کا یہ ارشاد روایت ہوا ہے کہ شیطان جماعت سے بھاگتا ہے یعنی ملت کی جمعیت اور اتحاد میں بڑی برکت ہے۔ دوسرے اور تیسرے شعر میں اسی حدیث کی طرف تلمیح ہے۔ ہر مسلمان کو رسولِ اکرمؐ کا یہ فرمودہ پلّے باندھ لینا چاہئے کہ

جماعت کی برکت شیطان کو دُور بھگاتی ہے :

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشرؓ   ہست شیطاں از جماعت دُور تر*

فرد اور ملّت کی مثال ایسی ہے جیسے ستارے اور کہکشاں یا جیسے سلک و گوہر یعنی موتی اور ان کو لڑی کی صورت میں پروئے رکھنے والا دھاگا، ایک دوسرے کی تصویر، ایک دوسرے کے لئے ناگزیر، لازم و ملزوم :

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند   سلک و گوہر کہکشاں و اختر اند

فرد کو ملّت کی بدولت عزّت و احترام حاصل ہوتا ہے اور ملّت کو افراد کی وجہ سے ضابطہ و نظام ہاتھ آتا ہے۔ فرد جب جماعت میں گم ہو جائے تو وہ قطرے سے سمندر بن جاتا ہے :-

فرد می گیرد ز ملت احترام   ملّت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود   قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد اور جماعت کا باہمی ربط کیا اور کیسا ہونا چاہیئے ؟ اس سوال پر مفکّرین میں شدید اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض کا رجحان فردیت کی طرف ہے۔ وہ جماعت کو بے حقیقت اور مصنوعی چیز سمجھتے ہیں اور فرد کی انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ وقعت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کو اپنے فکر و عمل میں قطعی آزاد ہونا چاہیئے۔ جماعت یا قوم کو اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ فرد کی آزادی میں حائل ہو یا اس سے کسی قسم کی قربانی اور ایثار کا مطالبہ کرے۔ ان کے برعکس بعض مفکّرین فرد کی ذاتی حیثیت کو قطعی غیر اہم خیال

---

* اس مصرع سے متعلق حدیث اور حدیث کا ترجمہ یہ ہے : اے مسلمانو! جماعت کے ساتھ رہو کیونکہ جو جماعت سے کٹ گیا وہ دوزخ میں جا پڑا۔ (ترمذی)

کرتے ہیں۔ ان کا سارا زور جماعت یا قوم پر ہے جو ان کے نزدیک فرد کے مقابلے میں کہیں زندہ اور باقی رہنے والی حقیقت ہے۔ اس گروہ کے خیال میں فرد کا سب سے بڑا فرض اور سب سے شاندار کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادیت اور اپنی ذات کو جماعت پر قربان کر دے یا اس کی خاطر زندہ رہے۔ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو فرد اور جماعت کو دو قطعی متضاد اور مخالف وجود قرار دیتا ہے۔ اس کی رائے میں فرد کا نقصان جماعت کا فائدہ اور جماعت کا نقصان فرد کا فائدہ ہے۔ مختصراً یہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ فرد اور جماعت ہمیشہ سے ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ دونوں کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ لہٰذا جس کا بس چلتا ہے وہ دوسرے کو دبا اور دبوچ لیتا ہے۔

ان مفکرین کے مقابلے میں اقبال کا اندازِ نظر افراط و تفریط سے پاک اور عدل و توازن کا حامل ہے۔ وہ فرد کی انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیتے اور اس کے نشوونما و ارتقاء کی فکر کرتے ہیں لیکن ان کے خیال میں فرد اور جماعت کے مفاد آپس میں ٹکراتے نہیں، نہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہیں بلکہ ان کا نفع و نقصان ایک ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مادی اور روحانی اعتبار سے اس طرح وابستہ و پیوستہ ہیں جیسے تسبیح کے دانے، موتیوں کی لڑی یا ستاروں کا جھرمٹ۔

جو لوگ قوم کو فرد کی آزادی میں حائل تصور کرتے ہیں اور جماعت کو جبر و استبداد کا ایک ادارہ قرار دیتے ہیں، ان کے لئے اقبال کا جواب یہ ہے کہ قوم کا اجتماعی نظام فرد کی صلاحیتوں کا خون نہیں کرتا بلکہ اس کی بے راہروی کی مناسب روک تھام کر کے اس کی شخصیت میں ضبط و نظم اور سلامت روی کی گراں مایہ صفت پیدا کرتا ہے۔ رائے عامہ کا دباؤ افراد کے حق میں عین رحمت ہے۔ یہ دباؤ بظاہر ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اسکے

اثرات نہایت خوشگوار اور قابلِ قدر ہوتے ہیں۔

اس موضوع پر اقبال نے تین شعر کہے ہیں اور تینوں ہی عمدہ ہیں۔ (۱) قوم فرد کو نظم و ضبط سے آشنا کرتی اور اسے اعتدال پسندی کا سبق دیتی ہے (۲) ملّت دوست فرد شمشاد کی طرح ہے کہ جس کی جڑیں تو زمین میں ایک جگہ گڑی ہوتی ہیں مگر اس کی شاخوں اور تنے کو پھولنے پھلنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ (۳) جو شخص اپنے آپ کو ملّت کے آئین کا پابند بنا لیتا ہے۔ اس کی شخصیت نافۂ آہو کی طرح بیش قیمت اور مرکزِ توجہ بن جاتی ہے:

قوم با ضبط آشنا گرداندش   نرم رو مثلِ صبا گرداندش

پا بہ گِل مانندِ شمشادش کند   دست و پا بندد کہ آزادش کند

چوں اسیرِ حلقۂ آئیں شود   آہوئے رم خوئے او مشکیں شود

جماعت افراد میں صرف ضبط اور سلامت روی ہی پیدا نہیں کرتی وہ افراد کی صلاحیتوں کے لئے میدانِ عمل بھی مہیا کرتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے مسائل اگر ہمیں درپیش نہ ہوں اور ان کے تقاضے ہم کو بے تاب نہ کریں تو ہمارے فکر و عمل کی رگوں میں جوش و جذبے کا لہو سرد پڑ جائے۔ افراد کے اندر اعلٰے مقاصد کی لگن قوم ہی کے اجتماعی نظام اور اس کے الجھے ہوئے مسائل کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ قوم کے حالات ہی ہمارے اندر ہیجان پیدا کرتے اور ہماری قوتوں کو للکارتے، پکارتے اور بیدار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے جماعت کا وجود افراد کی ترقی و تکمیل کے لئے قطعی ناگزیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ جو لوگ ملّت سے غفلت یا بے تعلقی برتتے ہیں ان کی صلاحیتوں کا شعلہ جلد سرد پڑ جاتا ہے، اور ان کی قوتوں کا شیرازہ بکھرتے دیر نہیں لگتی:

ہر کہ آب از زمزمِ ملت نخورد　　　شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

فردِ تنہا از مقاصد غافل است　　　قوتش آشفتگی را مائل است

خودی اور بیخودی

رموز کا پہلا باب دو بندوں پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں جیسے ہم مطالعہ کر چکے ہیں قوم اور فرد کے باہمی ربط اور آہنگ کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہ ربط و آہنگ تضاد اور تصادم کی خلش سے پاک ہے۔ قوم افراد کے بغیر نہیں بنتی اور افراد قوم کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے۔ دوسرے بند میں انہی خیالات کو زیادہ گہرائی اور فلسفیانہ عمق کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے ان کا 'خودی' اور 'بیخودی' کا تصور آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

اقبال نے فلسفہ و تصوف کی بے شمار اصطلاحوں کو نیا مفہوم اور نئی معنویت بخشی ہے۔ ان میں 'خودی' اور 'بیخودی' بلاشبہ سب سے اہم ہیں۔ خودی کا لفظ اُردو اور فارسی شعر و تصوف کی کتابوں میں غرور، تکبر اور خود بینی کے معنوں میں زیادہ استعمال ہوا ہے اور ذات اور نفس کے معنوں میں کم کم۔ اقبال نے اسے مقدم الذکر مفہوم سے بالکل الگ کر لیا اور اس کے دوسرے معنوں میں بڑی وسعت، گہرائی اور ندرت پیدا کی۔ اسی طرح بیخودی کو فارسی اور اردو کے شعراء کیف و مستی اور از خود رفتگی اور سرشاری کے معنوں میں لائے ہیں۔ غالب کا یہ شعر اسی مفہوم کی نمائندگی کرتا ہے:

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

لیکن اقبال کے ہاں اس کا مفہوم یکسر اور ہے۔ خودی غرور و تکبر نہیں، اپنی ذات کی پہچان اور اس کی تکمیل ہے۔ بیخودی عشق یا شراب کے نشے میں اپنے آپ کو بھول جانا

یا بھلا دینا نہیں بلکہ ذاتی مفاد اور نفسی اغراض کو ملت کے وسیع تر مفاد پر قربان کر دینے کا نام ہے۔ زیرِ نظر باب اس خیال کو بڑی دلکشی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ تو نے خودی اور بیخودی کی حقیقت کو نہ پایا اور تیرا ذہن غلط راستوں پر جا پڑا۔ سنو! تمہاری خاک کے اندر ایک نوری جوہر ہے جس کی قدر و قیمت کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ جسے تم عقل و ادراک کہتے ہو یہ اُس نوری جوہر کی ایک کرن ہے۔ تمہارا عیش اور تمہارا غم اسی کے عیش و غم سے عبارت ہے۔ تمہاری زندگی اس کے انقلاباتِ پیہم کی مرہونِ منت ہے۔ یہ جوہر اپنی ذات میں شدید انفرادیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری شخصیت تم سے اور تمہاری شخصیت مجھ سے جدا ہے۔ یہ جوہر بڑا خوددار، غیرت مند اور سخت کوش ہے۔ یہ آزاد بھی ہے اور پابند بھی۔ یہ جزو ہے لیکن کُل کو پانے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ پیہم کشمکش اور مسلسل تگ و دو کا عادی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو میں نے کبھی خودی اور کبھی زندگی کا نام دیا ہے :

خو گرِ پیکارِ پیہم دیدمش ہم خودی ہم زندگی نامیدمش

لیکن یہ جوہر جب اپنی ذات کی خلوت گاہ سے نکل کر ہنگامۂ عالم میں شریک ہوتا ہے تو اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اس کے دل میں 'من' کی بجائے 'او' اور 'تو' کا نقش گھر کر لیتا ہے۔ یعنی وہ اپنے مفاد کی بجائے دوسروں کے مفاد اور بہبود کی فکر کرتا اور انتہائی ایثار سے کام لیتا ہے۔ وہ اپنی آسائش اور آزادی کو بہ صد خوشی قوم کی فلاح پر قربان کر دیتا ہے۔ یہی اصل بیخودی ہے۔ اس ایثار اور بے نفسی کی بدولت خودی برگِ گل سے گلزار بنتی ہے :

در جماعت خود شکن گردد خودی تا زِ گلبرگے چمن گردد خودی

قومیت کی تشکیل

قوم افراد کے مجموعے یا جمعیت کا نام ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ مجموعہ کس اصول و ضابطے کے تحت تشکیل پاتا ہے؟ کونسی چیز افراد میں قومیت کا شعور بیدار کرتی اور اسے پروان چڑھنے میں مدد دیتی ہے؟ انسان طبعاً معاشرت پسند ہے۔ مل جل کر رہنا ہماری جبلت میں ہے۔ اس کے باوجود قومیت کی موجودہ ہیئت تاریخِ انسانی کا نسبتاً ایک جدید واقعہ ہے۔ ہزار ہا سال تک انسان کی ہمدردیاں خاندان اور پھر قبیلے تک محدود رہیں۔ ایک خطہ میں بسنے والے، ایک زبان بولنے والے اور ایک سے عقیدوں کے حامل انسان قبائل میں بٹے ہوئے تھے اور ان کی صلح و جنگ کا محور بھی قبائلی وفاداریاں تھیں۔ اس کے بعد نوعِ انسانی نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہیں کہیں شہری ریاستیں اور علاقائی حکومتیں وجود میں آئیں۔ اس کے ساتھ نسل اور رنگ کے امتیازات واضح اور شدید ہوگئے اور آخر کار وطن قومیت کی بنیاد قرار پایا۔ اقبال ان میں سے کسی کو ملت کی بنیاد تسلیم نہیں کرتے۔ قبیلہ، نسل، رنگ، زبان اور وطن، یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ جو بھی اہمیت رکھتی ہوں، انسانوں کے حقیقی اتحاد اور ملت کی اساس نہیں ہو سکتیں۔

اقبال کے نزدیک انسانوں کے اتحاد کی صحیح اور فطری اساس نبوت ہے۔ نبوت کا ادارہ صرف اخلاقیات اور مابعد الطبعیات سے ہی تعلق نہیں رکھتا، معاشرتی اور عمرانی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ درحقیقت تاریخِ انسانی کا کوئی واقعہ اجرائے نبوت سے زیادہ اہم نہیں۔ آغازِ نبوت سے پہلے انسانوں کی کیا حالت تھی؟ تہذیب و تمدن اور علم و شائستگی سے بے بہرہ قدیم زمانوں کا انسان عجیب و غریب توہمات کا شکار تھا۔ وہ اپنے وجود کی حقیقت سے قطعی بیگانہ تھا۔ اس کا ذہن ناتواں اور دل بودا تھا۔ وہ فطرت کے ہر طاقتور مظہر سے خوف کھاتا اور احساسِ کمتری کے باعث اس کے سامنے جھک جاتا

تھا۔ دیو و پری کے قصے اس کے جسم و جان پر لرزہ طاری کر دیتے اور زمین و آسمان کی وسعت دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی حد نہ ہوتی تھی۔ وہ اتحاد، ایثار اور محبت کی لذتوں سے ناآشنا ایک اجنبی دنیا اور ایک غیر ہمدرد فضا میں حیوانوں کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

دل و دماغ کی اس پستی اور بیچارگی سے جس چیز نے انسانوں کو نجات دلائی وہ نبوت تھی۔ نبوت کی بدولت پہلی بار انسانوں میں انسانیت کا احساس بیدار ہوا۔ نبیوں نے توحید کے اسرار سے آگاہ کر کے ان کے دلوں سے مظاہرِ فطرت کا خوف دور کیا اور ان میں خود اعتمادی، فراخ نظری اور بلند حوصلگی پیدا کی۔ 'رموز' کے دوسرے باب میں اقبال نے نبوت کے برکات و احسانات کو بڑے مؤثر اور محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ انسان طرح طرح کی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ صاحبِ نبوت نے اسے ان پابندیوں سے آزاد کیا اور اسے بتایا کہ خدائے واحد کے سوائے کائنات کی کوئی چیز اس کے سجدے کی حقدار نہیں۔ کسی مخلوق شے کے سامنے جھکنا انسان کی شان کے خلاف ہے:

از خداوندان ربایَد بندہ را بندہا از پا کشایَد بندہ را
زیں بتانِ بے زباں کمتر نہٗ گویدش تو بندۂ دیگر نہٗ

نبوت نے کائنات کی حقیقت اور انسانی زندگی کی فضیلت سے آگاہ کر کے نہ صرف عقلِ انسانی کو توہمات کے اندھیرے غار سے باہر نکالا بلکہ اسے سیدھی راہ پر چلنے کے قابل بنایا اور اسے منزلِ مقصود کا پتہ دیا۔ گم کردہ راہ عقل کی سچی رہنمائی نبوت کا عظیم کارنامہ ہے:

بخشد ایں بے مایہ را سرمایۂ عقلِ عریاں را دہد پیرایۂ

صاحبِ نبوت کی شخصیت میں جادو کی سی تاثیر ہوتی ہے۔ اس کی خدا پرستی، اثبات

دوستی اور خلوص و تعاون انسانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں کی وفاداریوں سے بلند کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مرنے والے قبائل باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور یہ اتحاد ان کو ایک بے پناہ قوت بنا دیتا ہے:

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند　　محفلے رنگیں ز یک ساغر کند

دیدۂ او می کند لب را جاں دہد　　تا دوئی میرد یکی پیدا شود

نبوت جس حریتِ فکر و عمل اور اتحادِ نظر کا سبق دیتی ہے اس کی بدولت انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ ان کا اندازِ نظر، ان کا طرزِ عمل، ان کے مقاصدِ حیات غرض ہر شے میں ایک بنیادی تبدیلی آجاتی ہے۔ نبوت ان کو ذرے سے آفتاب بنا دیتی ہے:

ذرۂ بے مایہ ضو گیرد ازو　　ہر متاعے ارج نو گیرد ازو

نقش پایش خاک را بینا کند　　ذرہ را چشمک زنِ سینا کند

تازہ اندازِ نظر پیدا کند　　گلستاں در دشت و در پیدا کند

اس تمام انقلاب آفرینی کا راز نکتۂ توحید میں مضمر ہے۔ صاحبِ نبوت انسانوں کو ان کے ذاتی اور قبائلی، نفسانی اور مادی مقاصد سے بیگانہ و بیزار کر کے ایک بڑے مقصد اور نصب العین کی لگن ان کے دل میں لگا دیتا ہے۔ پھر یہی جذب و شوق ان کی زندگیوں کا محور اور ان کی سرگرمیوں کا مدار قرار پاتا ہے:

تا سوئے یک مدعایش می کشد　　حلقۂ آئینِ بپایش می کشد

نکتۂ توحید باز آموزدش　　رسم و آئینِ نیاز آموزدش

قومیت کا یہ تصور بعض ذہنوں کو انوکھا اور شاید فرسودہ معلوم ہوگا۔ واقعہ یہ ہے

کہ خود اقبال بھی ایک زمانے میں اس تصور سے بیگانہ نہ تھے۔ انگلستان جانے (۱۹۰۵ء) سے پہلے ان کے ذہن میں بھی قومیت کی اساس جغرافیائی وطن اور وطن پرستی ہی تھی۔ لیکن یورپ پہنچ کر جب انہوں نے اس تصور کی ہولناکیوں کا بچشم خود مشاہدہ کیا اور اس کی بدولت دلوں میں نفرت کی جو آگ سلگ رہی تھی۔ اس کو دیکھا اور انسان کو انسان کے خون کا پیاسا پایا تو ان پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ اسلام نے رنگ و نسل اور ملک و وطن کے امتیازات کو جس طرح مٹایا ہے اس سے بہتر صورت انسانوں کے اجتماع کی اور کوئی نہیں لہٰذا وہ وطنیت کے جدید تصور کے سخت ترین مخالف اور اسلامی نظریہ قومیت اور اتحادِ آدم کے زبردست مبلغ بن گئے۔

یہاں لفظ وطنیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ اقبال ہر قسم کی وطن دوستی اور وطن پروری کے مخالف تھے۔ انہوں نے "رموز" سے کئی برس قبل اس موضوع پر اردو میں جو نظم لکھی اس میں اس امر کی وضاحت کر دی ہے۔ انسان جس ملک میں پیدا ہوتا ہے، جہاں اس کا بچپن اور جوانی گزرتی ہے، جہاں اس کے خویش واقارب رہتے بستے ہیں۔ اس خطے سے اُس کی محبت ایک فطری امر ہے۔ خود رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں اس فطری جذبے کو سراہا گیا ہے۔ اقبال بھی ان جذباتِ خدمت و محبت کے قدردان اور حامی ہیں۔ ان کے نزدیک ملک کی بہتری اور بہبود کے لئے کوشش کرنا اور ہم وطنوں کی آزادی اور ترقی کی راہ میں جان تک دے دینا نہایت فضیلت کی باتیں ہیں لیکن یہی معصوم تصور جب سیاسی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ جب ایک ملک میں بسنے والے اپنے مفادات کو بقیہ نسلِ انسانی کے مفادات سے الگ یا مقدم خیال کرنے لگتے ہیں۔ جب حق و ناحق کی کشمکش میں حق کی بجائے وطن کا ساتھ دینا جزوِ ایمان قرار پا جاتا ہے۔ جب تجارت اور سامراجیت کی مسابقت

دلوں میں نفرت کے بیج بوتی اور جنگ کے شعلے بھڑکاتی ہے تو اقبال اس تصورِ وطنیت کی شدید ترین مخالفت کرتے اور اسے نسل آدم کے لئے انتہائی تباہ کن ادارہ قرار دیتے ہیں۔ جدید ترین زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ وہ قوم پرست (NATIONALIST) نہیں بلکہ انسان دوست یا اقوام دوست (INTERNATIONALIST) ہیں۔

اور ان کے نزدیک اِس اقوام دوستی یا بین الاقوامیت کا سب سے اچھا نمونہ اسلام نے پیش کیا ہے جس نے ہیئتِ اجتماعیہ کی بنیاد نہ نسل و رنگ پر رکھی ہے اور نہ ملک و وطن پر۔ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت (توحید) کو تسلیم کرنے والے اور اس کی جاری کردہ سنّتِ نبوّت پر ایمان رکھنے والے خواہ وہ کسی نسل، کسی رنگ، کسی وطن سے تعلق رکھتے ہوں، وہ جو بھی زبان بولتے ہوں اور جیسا بھی لباس پہنتے ہوں قومیتِ اسلام میں داخل ہیں۔ ان کی وحدت و مساوات میں کوئی شے حائل نہیں۔ وہ سب بھائی بھائی ہیں۔

باب ۱

توحید کی حقیقت

جیسا کہ گذشتہ باب کے آخر میں بیان کیا گیا ہے اقبال کے نزدیک اسلام میں قومیت کے بنیادی ارکان دو ہیں۔ اوّل توحید اور دوم نبوت۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ مسلمان کی قومیت رنگ و نسل یا زبان و ادب کے اتحاد پر نہیں، بلکہ کلمۂ طیبہ کی اساس پر قائم ہے۔ کلمۂ طیبہ کے دو ارکان ہیں۔ پہلا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جس کے معنی ہیں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم خدائے واحد کے سوا کسی کے سامنے جھکنے اور سجدۂ عبودیت بجا لانے کے لئے تیار نہیں۔ اور دوسرا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یعنی محمدؐ خدا کے رسول اور اس کے فرستادہ نبی ہیں۔ "رموز" کے تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے باب میں اقبال نے رکنِ اوّل یعنی توحید سے بحث کی ہے۔

یہ بحث نہ واعظانہ ہے نہ منطقیانہ۔ اس کا اسلوب بہ یک وقت شاعرانہ اور فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ اس لحاظ سے کہ ان ابواب میں بہت سے شعر اپنے اندر زبردست جذباتی اپیل رکھتے ہیں۔ ان میں شعریت بھی ہے اور شاعر کے دل کا سوز و یقین بھی۔ اور فلسفیانہ یوں کہ اس میں نظریۂ توحید پر ایک نئے اور نفسیاتی انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلامی فکر اور بالخصوص علمِ کلام کی تاریخ میں ایسا وقیع کارنامہ بہت کم لوگوں کے

حصے میں آیا ہوگا۔

کائنات کی گتھی

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے، وہ کائنات کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس کے دل میں سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کا یہ حیرت انگیز نظام کیا چیز ہے؟ یہ سورج، یہ چاند، یہ رات کو جگمگانے والے ستارے، یہ نیلگوں آسمان، یہ فضا کی لامحدود وسعت، یہ زمین کا وسیع و عریض ٹکڑا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ بادل، یہ گھٹائیں، یہ گردشِ لیل و نہار یہ سب کچھ آخر کیسا اور کیوں ہے؟ کیا اس حیرت زا اور محکم نظام کو کسی نے بنایا ہے یا یہ آپ سے آپ موجود ہے؟ اگر آپ سے آپ موجود ہے تو کیونکر؟ اور اگر کسی نے بنایا ہے تو کس نے؟ اس کا بنانے والا کون اور کیسا ہے؟ اس کا ہماری ذات سے کیا تعلق ہے؟ یہ سوالات نسلِ آدم کا وردِ جگر ہیں۔ وہ ان میں سرگرداں رہی ہے اور نہ جانے کب تک رہے گی۔

ان سوالات کو انسانوں کے مختلف گروہوں نے مختلف طریقوں سے حل کیا ہے۔ ان میں دو گروہ سب سے ممتاز ہیں۔ اوّل فلسفی اور سائنسدان۔ دوم پیغمبر اور صوفی۔ فلسفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے فہم و ادراک سے کائنات کی حقیقت معلوم کرنی چاہی ہے اور اپنے افکار کو فلسفہ اور سائنس کی کتابوں میں پیش کیا ہے۔ ان میں سے بعض نے کہا یہ کائنات بغیر کسی غرض و غایت اور بغیر کسی سوچی سمجھی اسکیم کے یوں ہی مادے کے تخلیقی جوش سے بنی اور بڑھتی آئی ہے اور اس میں ایک خاص نوع کا استحکام پیدا ہو گیا ہے جو کسی وقت خود بخود فنا ہو جائے گا۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے بس وہی کچھ ہے۔ نظروں سے اوجھل کوئی حقیقت اس کائنات کے پیچھے مخفی نہیں کہ اس کی تلاش کی جائے۔ بعضوں نے کہا۔

ممکن ہے اس کائنات، اس نظامِ عالم کے پیچھے کوئی حقیقت، کوئی ذات کارفرما ہو، لیکن اس کو پانا یا سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں لہٰذا اس کے بارے میں تردّد کرنے یا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ فلسفیوں میں سے چند نے خدا کے وجود اور اس کی زندۂ جاوید ہستی کا اقرار کیا ہے مگر وہ اس کے بارے میں یقین اور وضاحت کے ساتھ کچھ نہ بتا سکے لہٰذا ان کی تعلیم دوسروں کے دلوں میں یقین و ایمان کی حرارت پیدا کرنے سے قاصر رہی۔

اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ پیغمبروں کا تھا جو دنیا کے مختلف خطّوں، مختلف قوموں اور مختلف زمانوں میں پیدا ہوتے۔ اس کے باوجود ان کے نظریات میں حیرت انگیز مطابقت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا یہ کائنات آپ سے آپ، یوں ہی بغیر کسی مقصد کے وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے ایک علیم و بصیر اور قادر و حکیم ہستی نے عظیم مقاصد کے پیشِ نظر تخلیق کیا ہے اور اس ہستی کو پانا اور اس سے اپنا تعلق پیدا کرنا نہ صرف ہمارے لئے ممکن ہے بلکہ ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ انہوں نے خالقِ کائنات سے اپنے براہِ راست تعلق کا اعلان کیا اور اپنے خیالات اور طرزِ حیات سے دو چار نہیں، دس بیس نہیں، لاتعداد انسانوں کی زندگی میں عظیم انقلاب بپا کر دیا۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ خدائے واحد کی ہستی کا یقین اس کی ذات سے محبت اور اس کے احکام کی بجا آوری تھا اور تاریخِ عالم اس بات کی شاہد عادل ہے کہ اس تعلیم کی بدولت عالمِ انسانی کو جو بزرگی، جو عظمتِ کردار اور جو تقدس حاصل ہوا وہ اسے کسی اور طریق سے حاصل نہیں ہو سکا۔ اس تعلیم کے سہارے انسان اپنے انتہائی رتبے اور مرتبے کو پہنچا۔

اقبال اپنی تمام فلسفہ دانی کے باوجود فلسفیوں سے بدظن اور پیغمبروں کے حلقہ بگوش ہیں۔ ان کے نزدیک انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی فلاح کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ

سب ہے کہ ان کے دلوں میں توحید کا عقیدہ راسخ ہو جائے، اور ان کی زندگیاں سراپا اس کے زیرِ اثر ہوں۔

فرد اور توحید

اس اثر کو انہوں نے تین پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ انفرادی لحاظ سے فرد کے قلب و ذہن کے تقاضے صرف عقیدۂ توحید سے پورے ہوتے ہیں۔ اس کی روح کی پیاس اسی سرچشمے سے بجھتی ہے۔ اس کے ادراک کی خامی اسی کی بدولت دور ہوتی ہے۔ توحید سے عالموں کو تحیّر اور عاشقوں کو جذبۂ عمل نصیب ہوتا ہے۔ اس کے سایہ میں پست سربلند ہوتے ہیں اور خاک کے پتلے نوری نہاد اور مولا صفات بنتے ہیں۔ فرد کے لئے توحید حکمت و خیر، تمکین و وقار اور قوتِ حیات کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ جو کوئی اس سے فیضان حاصل کرتا ہے اپنی شخصیت میں نئی آب و تاب پاتا ہے:

پست اندر سایہ اش گردد بلند　　　خاک چوں اکسیر گردد ارجمند
قدرتِ او برگزیند بندہ را　　　نوعِ دیگر آفریند بندہ را

انسانی عقل جب تک توحید سے نامحرم رہی بھٹکتی رہی، ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اس نے حقیقت کو پانے کے لئے جتن کئے مگر کامیاب نہ ہوئی اور اپنے ہی پیدا کردہ اوہام کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گئی۔ تا آنکہ وہ رمزِ توحید سے آگاہ ہوئی اور اس مسافرِ گم کردہ راہ کو منزل کا نشان مل گیا۔ اس موضوع پر اقبال کے دو شعر نہایت بلیغ اور پُر لطف ہیں:

در جہانِ کیف و کم گردید عقل　　　پَے بہ منزل برد از توحید عقل
ورنہ ایں بیچارہ را منزل کجاست　　　کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست

جو انسان رمزِ توحید کو پالیتا ہے، اس کے راستے کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔

اس کے دل کا تذبذب دُور ہو جاتا ہے اور کائنات کی حقیقت اس کے ضمیر پر روشن ہو جاتی ہے۔ اس کی نگاہ ماورا تک دیکھ سکتی ہے:

بیم و شک میرد عمل گیرد حیات   چشم می بیند ضمیرِ کائنات

جماعت اور توحید

دوسرا پہلو اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر لحاظ سے ایک ہوں، ہمارے مقاصد اور نصب العین ایک ہوں، ہمارا اندازِ نظر ایک ہو، ہمارا طرزِ عمل ایک ہو۔ ہمارے لئے نیک و بد کا معیار ایک ہو، توحید پرستوں کے فکر و عمل میں کامل یکرنگی اور ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے۔ جب سب کا خدا ایک ہے۔ ان کا خالق و مالک ایک ہے تو پھر گورے اور کالے، اور غریب و امیر میں امتیاز غیر حقیقی ہے۔ توحید کی بدولت افراد میں اتحاد و مساوات کا پایا جانا اقبال کا محبوب موضوع ہے۔ اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی دور میں انہوں نے توحید سے انسانوں کی وحدت پر استدلال کیا ہے۔ "تصویرِ درد" (۱۹۰۴ء) میں نسلی و قومی تعصبات سے دلوں کو پاک رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے
کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے

اسی طرح "جواب شکوہ" میں مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا گیا ہے کہ جب تمہارا خدا ایک ہے نبی ؐ ایک ہے، کتابِ ہدایت ایک ہے تو پھر تم مسلمان کیوں ایک نہیں ہو۔

تم نے کبھی سوچا کہ تمہاری یہ فرقہ آرائی توحید پرستی کے منافی ہے؟ اگر تم ایک خدا کو حقیقی معنوں میں ماننے والے ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ تم بھی ایک ہوتے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی، نقصان بھی ایک ‫ ‫ ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک ‫ ‫ کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

'رموز' کے پیشِ نظر حصے میں اقبال نے اس بات پر زور دیا ہے کہ توحید ہماری قومیت کی جان ہے۔ ملتِ اسلامیہ ایک جسم کی مانند ہے۔ اور توحید اس کی روحِ رواں ہے۔ یہی رشتہ ہمارے افکار و اعمال کا شیرازہ بند ہے۔ اسی کی بدولت بلال حبشیؓ اور ابوذر غفاریؓ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ دنیا کی باقی قومیں نسب، وطن اور نہ جانے کس کس بات پر فخر کرتی ہیں مگر ہمارے لئے ان میں سے کوئی شے باعثِ افتخار نہیں کیونکہ ہمارے دلوں میں توحید کا نقش گہرا ہے۔ ہماری ملت کی اساس چونکہ خدا کے ایک ہونے کے عقیدہ پر ہے لہذا اس کی بدولت اور اس کی برکت سے ہم بھی ایک ہیں، ہماری زبان، ہمارے دل اور ہماری جان ایک ہے:

ما ز نعمتہائے او اخوان شدیم

یک زبان و یک دل و یکجان شدیم

توحید اور نفسیاتِ انسانی

اب تک ہم نے توحید کے دو پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں سے پہلے کو اخلاقی اور دوسرے کو اجتماعی یا عمرانی کہہ سکتے ہیں۔ تیسرا پہلو نفسیاتی ہے۔ یعنی اس

کا تعلق اس امر سے ہے کہ حقیقۂ توحید انسان کی نفسیات پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے اخلاق اور اجتماعی زندگی کو متاثر کرنے سے پہلے اس کے نفس کی گہرائیوں میں کیا تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ اصول توحید سے اقبال نے جس قدر بحث کی ہے یہ حصہ اس میں نہایت دقیق اور خصوصی تعریف کا مستحق ہے۔

علم النفس بہت سے دوسرے علوم کے مقابلے میں بیشک کم عمر اور نوخیز سائنس ہے۔ اس کے باوجود اس نے تھوڑے ہی عرصے میں وہ درجہ اور مقام حاصل کر لیا ہے۔ جو بہت سے پرانے علوم کو اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا موضوع خود انسان کی ذات ہے۔ یہ علم نفسِ انسانی کی پوشیدہ اور گہری خصوصیات کا پتہ لگاتا ہے اور اس کے احوال و کیفیات سے بحث کرتا ہے۔ ادھر مذہب، فلسفہ، شعر و ادب کا موضوع بھی بیشتر انسان ہے۔ لہذا جب سے علم کی اس شاخ نے ایک باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار کی ہے انسانی قلب و ذہن سے تعلق رکھنے والا کوئی شعبہ بھی اس کی طرف سے بے نیاز نہیں رہ سکتا اور اپنے حقائق کو علم النفس کے حقائق کی روشنی میں جانچنے پرکھنے پر مجبور ہے۔ اقبال نے جس زمانے میں اسرار و رموز تصنیف کیں اس وقت نفسیات اپنی اہمیت منوا چکی تھی۔ لہذا انہوں نے توحید کے ضمن میں انسانی نفسیات سے بحث کرنا ضروری خیال کیا۔

اقبال نے انسانی نفس کی تین بنیادی کمزوریوں کو لیا ہے۔ اوّل: یاس، دوم: حُزن، اور سوم: خوف۔ ان کے نزدیک یہ تین کمزوریاں ہماری تمام نفسیاتی اور اخلاقی بیماریوں کی جڑ ہیں۔ یہ اُمّ الخبائث ہیں۔ ان میں مبتلا انسان زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں کے برابر ہوتا ہے۔ ہماری زندگی آرزوؤں سے قائم ہے۔ ہزار مشکلات کے

باوجود جب تک امید و آرزو کا چراغ سینے میں روشن ہے ہمارے اندر زندگی اپنے تمام ممکنات کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن جب امید کا چراغ بجھ جائے، جب آرزوؤں کی شمع گل ہو جائے تو انسان کے ہاتھ سے زندگی کا دامن خود بخود چھوٹ جاتا ہے۔ یاس انسانی صلاحیتوں کے لئے موت کا پیغام ہے۔ ناامیدی زندگی کے سوتے خشک کر ڈالتی ہے:

از دمش میرد قوائے زندگی　　　خشک گردد چشمہائے زندگی

یہی حال حزن وغم کا ہے۔ حزن انسانی زندگی کو اندر ہی اندر اس طرح کھا جاتا ہے جیسے دیمک لکڑی کو کھا جاتی ہے یا جیسے چنار کی آگ اس کے تنے کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ حزن انسان کی بشاشت و مسرت پر ہی ڈاکہ نہیں ڈالتا اس کے جذبۂ عمل کو بھی غارت کرتا ہے۔ وہ انسان کو تخلیق اور جد و جہد کی دشواریوں سے ڈراتا اور تقدیر پر قانع بناتا ہے۔*

اسی طرح خوف انسان کی تمام اخلاقی فضیلتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ وہ ہمت و ولولہ اور شجاعت و مردانگی کا دشمنِ ازل ہے۔ اس کا سایہ عزم و ارادہ کے لئے مہلک ہے۔ انسان کی ذات سے جس قدر کمینہ حرکات سرزد ہوتی ہیں، غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ ان سب کی جڑیں خوف وبیم میں پیوست ہیں۔ خوشامد، جھوٹ، ریاکاری، ضمیر فروشی اور مکر و فریب یہ تمام اخلاقی عیوب جذبۂ خوف کی پیداوار ہیں۔ خوف انسان کو ان رذائل پر مجبور کرتا ہے اور اسکی شخصیت کو ننگِ انسانیت بنا دیتا ہے:

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست　　　اصل او بیم است اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کین و دروغ　　　این ہمہ از خوف می گیرد فروغ

---

* غم و حزن پر اقبال کا ایک مصرعہ یہاں درج کرنا کافی ہو گا:

غم رگِ جاں را مثالِ نشتر است

اقبال نے یاس، غم اور خوف کی معترت رسانیوں کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا۔ جدید ماہرین نفسیات نے ان نفسیاتی الجھنوں کی جو تصویر پیش کی ہے اور ان کے علیل میں مبتلا لوگوں کے جو احوال ہمیں سنائے ہیں وہ اقبال کے بیان سے کہیں زیادہ عبرتناک اور دہشت انگیز ہیں۔ توحید انسان کو ان امراض نفسی سے امان اور شفا بخشتی ہے۔ توحید کا عقیدہ جس دل میں راسخ ہو جاتا ہے یاس اور حزن و خوف کا اس میں گزر ممکن نہیں۔ جس طرح روشنی پھیلنے سے تاریکی غائب ہو جاتی ہے، اسی طرح توحید پرستی کے سامنے یہ نفسی کمزوریاں اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتیں۔ توحید پرستوں کی ہزارہا سال کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ انہوں نے بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے بھی انتہائی بے خوفی کا مظاہرہ کیا اور نازک سے نازک حالات میں بھی ان پر مایوسی طاری نہ ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود، حضرت موسٰیؑ اور فرعون، حضرت رسول کریمؐ اور کفار مکہ کی باہمی آویزش کے واقعات انسانی عزم و یقین اور جرأت و بے خوفی کی بلند ترین مثالیں ہیں جو خدائے واحد پر ایمانِ محکم کی بدولت قائم ہوئیں۔

توحید واقعی انسان کی کایا پلٹ دیتی ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس عقیدے کو اپنی زندگیوں میں برتیں اور اسے انقلاب آفرینی کا موقعہ دیں۔ محض اقرار زبانی سے کچھ حاصل نہیں۔ توحید دراصل انسانی قلب کا ایک بیش بہا تجربہ ہے جس کی بدولت یہ خیال اس کی نس نس میں سما جاتا ہے کہ اس کائنات کی خالق و مالک ایک زندۂ جاوید ہستی ہے جو علیم و بصیر اور حکیم و قدیر ہے، جس کی قدرت و حکمت کی کوئی حد نہیں، جس کی نگاہ سے کوئی شے مخفی نہیں۔ وہ انسان کو ہر وقت دیکھنے والی اور اس کے دل کے خیالوں کو جاننے والی ہے۔ وہی ذات ہماری مددگار اور ہماری عبادت کی حقدار ہے۔ یہ عقیدہ جب ذاتی

تجربات و واردات کی بنا پر ایک زندہ حقیقت کے طور پر انسانی قلب میں جاگزیں ہوتا ہے
جب وہ اس عقیدہ کو سفرِ حیات میں اپنا رہنما بناتا ہے، جب اس کے جذبات اس کی
گرمی اور آنچ محسوس کرتے ہیں تو اس کا کردار ایک نئے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ اس کی
نفسیات ایک خاص وضع اختیار کرتی ہے۔ اس میں مومن کی صفات ابھرتی ہیں، اور
آزمائشوں سے گزر کر پختہ ہو جاتی ہیں۔ ایسا انسان یاس، خوف اور حزن سے کبھی مغلوب
نہیں ہوتا، وہ ہر حال میں پُر امید، باتمکین اور نڈر رہے گا، دنیا کی کوئی قوت اسے خوفزدہ
نہیں کر سکتی۔ ناسازگار سے ناسازگار حالات اسے مایوس نہیں کر سکتے۔ غم اس کے
دل میں راہ نہیں پا سکتا۔

باب ۱۱

مقامِ رسالت

اسلامی قومیت کا دوسرا رکن رسالت ہے۔ رسالت درجے اور مرتبے کے لحاظ سے یقیناً توحید کے بعد آتی ہے مگر ہیئت اجتماعیہ کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت توحید سے کم نہیں۔ توحید کا عقیدہ کم و بیش دوسری قوموں اور مذہبوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ خود اسلام کی دعوت اہلِ کتاب کے نام یہ ہے کہ اگر تم ایک خدا کے ماننے والے ہو تو ہمارے تمہارے درمیان اشتراک و مودّت کی بے شمار راہیں کشادہ ہیں۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ توحید کسی ایک قوم کی خصوصیت نہیں مگر قومیت کی تقویم و استحکام کے لئے خصوصیات یا مابہ الامتیاز کا ہونا ضروری ہے۔ ہر قوم میں چند باتیں ایسی ضرور پائی جانی چاہئیں جو دوسروں میں نہ ہوں۔ جن کی بدولت اسے اوروں سے متمیز کیا جا سکے۔ اس کی انفرادیت کا راز انہی خصوصیات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ قومیتِ اسلام کا یہ مخصوص امتیاز رسالتِ محمدیہ ہے

جب سے اقبال کو قومیت کے جدید تصور کی تباہ کاریوں کا اندازہ ہوا تھا اور وہ اسلام کے عمرانی تصورات کی صداقت کے قائل ہوئے تھے۔ اس زمانے سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک وہ حضور رسالت مآب کی مرکزی حیثیت پہ زور دیتے رہے وہ ابھی ولایت ہی میں تھے کہ انہوں نے اس موضوع پر اپنا پہلا شعر (سنہ ۱۹۰۶ء)

کہا تھا :

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے (بانگِ درا)

اور وفات کے صرف چند ماہ پہلے انہوں نے اپنا وہ تاریخی قطعہ کہا تھا جس میں مولانا حسین احمد مدنی کو مخاطب کر کے قومیتِ اسلام کا راز بیان کیا گیا ہے ۔ اقبال نے تین اشعار کے اس قطعہ میں (جو ارمغان حجاز میں درج ہے) جس کی بلاغت بے مثل اور تاثیر لازوال ہے ۔ پہلے شعر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے ۔ کہ صدیاں گزر جانے پر بھی غیر عرب اسلام کی روح سے بیگانہ کے بیگانہ ہی رہے ۔ دوسرے شعر میں نظریۂ قومیت دہرایا گیا ہے ۔ تیسرے شعر میں جہاں اقبال کی معجز بیانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے ۔ وہ مسلمانوں کو خبردار کرتے ہیں کہ رسالتِ محمدیہ سے اپنی وابستگی میں وہ ذرہ برابر کمی نہ آنے دیں ۔ کیونکہ مسلمانی اور کافری کے درمیان یہی تعلقِ خاطر حدِ فاصل ہے ۔ جب تک یہ رشتہ قائم ہے ، دین قائم ہے ۔ جب یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا تو دین بھی باقی نہ رہے گا ۔

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

رسالت بنائے اتحادِ ملت

"رموز" کے ساتویں باب میں اقبال نے ذاتِ رسالت مآبؐ کی اس مرکزی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ مسلمانانِ عالم دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ وہ مختلف زبانیں بولتے اور مختلف سیاسی حالات سے دوچار ہیں۔ اس کے باوجود ان میں وحدت کا احساس کیوں اس قدر قوی ہے۔ مراکش کا ایک عرب انڈونیشیا کے ایک جاوی مسلمان کو ہزاروں میل کے بُعدِ مکانی کے باوجود کیوں اپنا بھائی سمجھتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم سب ایک نبی کے ماننے والے اور اس کے احکام و پیغام پر جی جان سے فدا ہونے والے ہیں۔ رسالت کی بدولت ہمارے دلوں میں اتحاد کی شمع روشن ہے۔ رسالت نے ہمیں ہم نفس اور ہم نوا بنا دیا ہے اور ہمارے اتحاد و وحدت کو پختہ بنیاد بخشی ہے۔

از رسالت ہم نوا گشتیم ما   ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
از رسالت در جہاں تکوینِ ما   از رسالت دینِ ما، آئینِ ما

جب ملت کا وجود و اتحاد رسالت مآب کا رہینِ منت ہے تو پھر رسالت سے ہمارا رشتہ جس قدر محکم ہوگا قوم میں اسی قدر زندگی اور تابانی بڑھے گی اور جس قدر یہ رشتہ کمزور ہوگا ملت کمزور ہوگی۔ دامنِ رسالتؐ کو ہاتھ سے چھوڑنا گویا اپنے ضعف و انتشار کو دعوت دینا ہے۔ اس سے ملت خزاں زدہ چمن کی طرح مرجھا جائے گی۔

دامنش از دست دادن مردن است
چوں گل از بادِ خزاں افسردن است

رسالتِ محمدیہ کا مقصود انسانوں کی آزادی، برادری اور برابری ہے۔

لیکن یہ وابستگی محض جذباتی نوعیت کا لگاؤ (مذہبی قسم کی) اندھی عقیدت نہیں جو

اکثر گروہوں میں اپنے دینی پیشوا کے لئے پائی جاتی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی دل بستگی، بصیرت اور حقیقت مبنی پر مبنی ہے۔ رسولِ کریم کا بنیادی پیغام — توحید — اگرچہ پہلے انبیائے کرام سے مختلف نہیں ہے لیکن توحید کی اساس پر جس قسم کی معاشی آپؐ نے تعمیر کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ بلاشبہ بنی اسرائیل کے انبیا حق و صداقت کی تعلیم دیتے رہے لیکن عملاً جو معاشرہ یہود نے قائم کیا اس میں نسلی امتیاز کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام اس نسلی امتیاز و تفریق کو مٹانے کی کوشش کی لیکن ان کے ماننے والوں نے بہت جلد مذہب کو ایک ذاتی معاملہ، ایک پرائیویٹ شے قرار دے لیا جس سے عیسائیت کے معاشرتی اصول مناسب نشوونما نہ پا سکے اور مطلوبہ معاشرت وجود میں نہ آئی۔ اس کے برعکس رسولِ کریمؐ نے ۲۳ سال کی طویل جدوجہد اور شبانہ روز محنت سے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جو انسان کی حریت، اخوت اور مساوات کی نہایت زندہ اور پائندہ مثال ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت کا راز اس بات میں چھپا ہے کہ آپ کی رسالت کا مقصود کوئی نیا گروہ پیدا کرنا یا اپنے ملک یا قوم کی برتری کا سکہ بٹھانا نہ تھا بلکہ عملی طور پر یہ ثابت کرنا تھا کہ تمام انسان بحیثیت انسان کے آزاد ہیں۔ برابر کا درجہ رکھتے ہیں اور بھائی بھائی ہیں۔ [1] رموز کے آٹھویں باب میں اقبال نے رسالت محمدیہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے لئے نہایت موزوں عنوان تحریر کیا ہے۔ "در معنی این کہ مقصود رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیس حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است"

---

[1] اس بارے میں کہ رسالتِ محمدیہ کا مقصود نوعِ انسانی کی آزادی، مساوات اور اخوت قائم کرنا ہے۔

اس باب میں اقبال بیان کرتے ہیں کہ کس طرح زمانۂ جاہلیت کا انسان اپنے درجے اور مرتبے کو بھول کر ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا صید زبوں تھا۔ قیصر و کسریٰ نے اپنی سطوت کے بل پر اور کاہن و پاپا نے تقدس اور روحانیت کا جال پھیلا کر سیدھے سادے انسان کو اپنی محکومی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ اپنے ان حاکموں اور پیشواؤں کے سامنے انسان بے بس اور ناکس تھا حالات نے اس کو انسان پرستی پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ یا تو اپنے آقاؤں کی خدمت میں لگا رہتا ان کے لئے محل اور باغ تعمیر کرتا اور ان کے کھیتوں میں کام کرتا یا پھر جو کچھ محنت و مشقت سے کماتا اور پیدا کرتا، اس کا غالب حصہ ان کی خدمت میں بطور ہدیہ و باج پیش کر دیتا تھا۔ غلامی نے اس کی فطرت مسخ کر ڈالی اور اندر ہی اندر اس کی انسانیت کا خون ہو چکا تھا۔

از غلامی فطرت او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

لیکن قدرت کو یہ حالات کب تک گوارا ہو سکتے تھے۔ ملوکیت اور پاپائیت کے دو پاٹوں میں پسنے والی انسانیت کی آہ و فغاں رنگ لائی اور مشیت ایزدی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مقرر فرمایا۔ آپ نے اپنی رسالت کے ذریعہ انسانوں کو ایک بالکل نئے تخیل سے آشنا کیا۔ ایک ایسے تخیل سے جو نہ یہودی اور عیسائی مذہب میں موجود تھا نہ یونانی اور رومی تہذیب میں۔ آپ نے مکہ میں انسانی ضمیر کی آزادی کی ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا۔ آپ نے کہا ہر شخص کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ جس عقیدے اور خیال کو غلط اور باطل سمجھتا ہو اس سے دست کش ہو جائے اور جس بات کو حق و صداقت جانتا ہو اسے اختیار کرلے اور اس کا اظہار کر سکے۔ کسی انسان کو خواہ

وہ کتنا ہی دولت مند اور صاحبِ اقتدار کیوں نہ ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دباؤ اور تشدد سے دوسروں کے عقائد اور تصورات کو اپنی رضا اور خیال کا پابند بنائے رکھے۔ اسی کے ساتھ آپ نے اعلان فرمایا کہ امیر اور غریب، سفید اور سیاہ، عربی اور عجمی حتیٰ کہ آقا اور غلام کے درمیان بہ حیثیت انسان کوئی فرق نہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کے سامنے ان کی معاشری یا نسلی حیثیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ خدا کے نزدیک ترلس وہی بہتر ہے جو زیادہ نیک، زیادہ پارسا اور انسانوں کا زیادہ ہمدرد اور بہی خواہ ہو۔ آپ نے اپنے طرزِ عمل اور اخلاق سے یہ بات عملی طور پر ثابت کر دی کہ تمام بنی آدم بھائی بھائی ہیں۔ عالمِ انسان ایک کنبہ اور ایک خاندان ہے۔ ہم سب ایک آدم کی اولاد اور ایک خدا کی مخلوق ہیں لہٰذا قانون اور معاشرت کی نگاہ میں ہمیں برابر ہونا چاہیے۔

یہ تخیل بڑا انقلابی تھا۔ اس نے نظامِ کہنہ کو بیخ و بن سے ہلا دیا۔ اس کی بدولت غریبوں اور محنت کشوں کی آبرو قائم ہوئی اور ملوکیت اور خواجگی کے آثار مٹنے لگے[1]۔ اس تخیل کی قوت سے طوق و سلاسل میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی، اخوت اور مساوات کی ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کیا جو حسب نسب اور دولت و رنگ کے اونچ نیچ سے مبرا تھی جہاں انسان صرف اپنی انسانیت کی بنا پر جانا پہچانا جاتا ہے۔ جہاں ذاتی کردار کی عظمت اور اخلاق کی پاکیزگی ہی عزت و شرف کی سند تھی[2]۔

---

[1] اعتبارِ کارِ بنداں وا فزود — خواجگی از کار فرمایاں ربود

[2] قوتِ او ہر کہن پیکر شکست — نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید — بندہ را باز از خداونداں خرید

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش دراصل پرانی دنیا کی موت تھی آپ کے پیغام وعمل نے تمام انسان دشمن اور انسانیت سوز تصورات اور ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔

زادن او مرگِ دنیائے کہن ۔۔۔ مرگِ آتش خانۂ دیر و شمن

آپ کے ضمیر پاک سے حریت آدم نے جنم لیا۔

حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او ۔۔۔ ایں مے نوشیں چکید از تاکِ او

مختصر یہ کہ انسانی حریت، مساوات اور اخوت کے وہ تصورات جن کی بدولت اٹھارویں صدی عیسوی میں انقلابِ فرانس برپا ہوا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنی جنگ آزادی جیتی۔ ان تصورات سے دنیا پہلی بار رسالت محمدیہ کی بدولت روشناس ہوئی تھی اور اسلامی قومیت کا خمیر انہیں انسانی قدروں سے تیار ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کا تصورِ قومیت دیگر تصوراتِ قومیت کے مقابلے میں کس قدر پاکیزہ اور انسان دوستی پر مبنی ہے۔ دیگر تصورات نوعِ انسان کو وطن، رنگ، نسل اور نسب کے حلقوں میں بانٹتے ہیں اور اس کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اسلام ان تمام باطل امتیازات کو مٹا کر سب انسانوں کو خدا شناسی اور آدم شناسی کا سبق دے کر ان کو ایک وحدت میں پرونے کا آرزومند ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے اسلام قومیت کی بجائے ایک اعلیٰ اور مبنی بر انصاف بین الاقوامیت کا حامی ہے۔ آج دنیا جن حالات سے دوچار ہے، جن گوناگوں مشکلات میں گرفتار ہے، ان سے نکلنے کا صحیح طریقہ وہی ہے جسے اسلام نے آج سے صدیوں پہلے تجویز کیا تھا۔ یعنی مادی اور طبعی رنگ کی قومیتوں کو مٹا کر روحانی اور اخلاقی اصولوں پر انسانوں کی وحدت کا قیام۔ دنیا کے ذہین ترین افراد میں یہ احساس روز بروز بڑھ

رہا ہے کہ وطنیت کی بنیاد پر اٹھائے جانے والا نظام اجتماعیت نوع انسانی کے مجموعی مفادات کی حفاظت میں ناکام رہا ہے۔ وہ وطنیت کی عائد کردہ قیود کو توڑنے کے لئے بے تاب ہیں ایسے افراد کے لئے اسلام کے بے نظیر تجربے میں ہدایت و رہنمائی ہے۔

رسالتِ محمدیہ کے مقصود و غایت سے بحث کرنے کے بعد اقبال نے ان کی مزید وضاحت کے لئے تین عدد تاریخی واقعات بیان کئے ہیں۔ ان میں پہلے کا تعلق اخوت سے دوسرے کا مساوات اور تیسرے کا حریت اسلامیہ سے ہے۔ ذیل میں ہم ان واقعات کو مختصراً درج کرتے ہیں۔

اخوتِ اسلامیہ

یہ واقعہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمانوں نے عراق و ایران فتح کیا تھا۔ شہنشاہِ ایران کا ایک سپہ سالار جنگ کے دوران میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ مسلمان مجاہد کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار ہونے والا کس منصب اور پایہ کا ایرانی ہے۔ ادھر ایرانی سپہ سالار نے عیاری سے کام لیا اور اپنا نام و پتہ بتائے بغیر مسلمان سے رحم دلی کی اپیل کی۔ اور منت سماجت کر کے اس سے جان کی امان چاہی مسلمان نے لاعلمی میں جان بخشی کا عہد دے دیا اور اپنی تلوار نیام میں کر لی۔ کچھ مدت کے بعد جب یہ راز کھلا کہ پناہ حاصل کرنے والا شخص مشہور ایرانی سالار جابان ہے تو اسلامی فوج میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور بعض مجاہدین نے امیر سپاہ حضرت ابو عبید ثقفی سے مطالبہ کیا کہ جابان کو اس کی گذشتہ اسلام دشمن سرگرمیوں کی بنا پر تہ تیغ کیا جائے۔ حضرت ابو عبیدؓ نے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ دیا کہ جابان کا قتل اخوتِ اسلامیہ کے منافی ہے۔ آپ نے اسلامی فوج کو مخاطب کر کے فرمایا۔ بھائیو! ہم سب مسلمان اور بھائی

بھائی ہیں۔ ہم میں اونچ نیچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا ہر فرد خواہ فوج میں اس کا کوئی بھی مرتبہ اور منصب ہو۔ پوری ملت کا نمائندہ ہے۔ ہمارے ہاں بلالؓ اور ابوذرؓ میں کوئی فرق نہیں۔ جب ملت کے ایک فرد نے کوئی عہد دے دیا ہے تو اس کا ایفا ہم سب پر فرض ہے۔ جاپان ہمارا دشمن سہی۔ وہ اپنی گذشتہ کاروائیوں کی بنا پر بلاشبہ گردن زدنی ہے مگر جب ایک مسلمان نے اس کو پناہ دے دی۔ اس کی جان بخش دی تو اس کا خون ہماری تلوار پر حرام ہو گیا۔

مساواتِ اسلامیہ

دوسری روایت خجند (موجودہ روسی ترکستان) کے ایک بادشاہ سلطان مراد سے تعلق رکھتی ہے۔ شاہجہان کی طرح ترکستان کے اس امیر کو بھی خوب صورت عمارات اور عالیشان مساجد بنوانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ ایک معمار نے جسے اپنے فن پر بڑا اعتماد تھا، سلطان مراد سے ایک مسجد تیار کرنے کا حکم حاصل کیا لیکن جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو سلطان کو پسند نہ آئی اور غصے میں آ کر اس نے معمار کا ہاتھ کٹوا دیا۔

غریب معمار اپنی محنت کا یہ انوکھا صلہ پا کر قاضی کے پاس فریاد لے کر پہنچا۔ قاضی نے سلطان کے جور و ستم کا حال سنا تو ششدر رہ گیا اور اس نے اسی وقت بادشاہ کی طلبی کا حکم جاری کر دیا۔ اگلے روز بادشاہ جب قاضی کی عدالت میں حاضر ہوا تو عجیب سماں تھا۔ ایک طرف غریب معمار تھا اور دوسری طرف ملک کا بادشاہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔ جب مقدمہ پیش ہوا تو سلطان نے اعتراف جرم کر لیا۔ قاضی نے جو اپنی رائے

ؔ ہر یکے از ما امین ملت است   صلح و کینش، صلح و کینِ ملت است

میں آزاد اور اپنے فیصلوں میں دیانت دار مشہور تھا فوراً قرآن حکیم کی وہ آیت پڑھی جس میں فرمایا گیا ہے کہ قصاص دیدے، تیں زندگی ہے۔ جو شخص کسی دوسرے کے ساتھ جس قدر زیادتی کرے اس سے اس کا ویسا ہی بدلہ لیا جائے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان۔ بادشاہ نے جب یہ حکم ربانی سنا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے بلاحیل وحجت اپنا ہاتھ سزا کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا، مجھے اس حکم سے مجالِ سرتابی نہیں یہ دیکھ کر مدعی کا دل پسیجا اور اس نے جھٹ قرآن حکیم کی وہ آیت پڑھی جس میں قصاص کے ساتھ احسان کرنے اور بخش دینے کو بھی ایک فضیلت کی بات قرار دیا گیا ہے۔ اور کہا میں خدا کے واسطے سلطان کو معاف کرتا ہوں۔ میرے لئے بس یہی کافی ہے کہ سلطان نے اپنی غلطی تسلیم کرلی اور اپنے آپ کو آئینِ پیغمبر کے سامنے جھکا دیا۔

اس حکایت کے بیان میں اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں ان میں دو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ قاضی جب قصاص والی آیت پڑھتا ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ ہمارے قانون کی نظر میں مسلمان غلام اور آقا میں کوئی فرق نہیں اور بادشاہ کا خون ایک معمار کے خون سے زیادہ سرخ نہیں ہوتا۔

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست　　　خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اور کہانی کے آخر میں جب معمار بادشاہ کے احساسِ ندامت اور آئین شعاری سے متاثر ہو کر اسے معاف کر دیتا ہے تو اقبال موضوع کو سمیٹتے ہوئے کہتے ہیں قرآن کے سامنے آقا اور غلام ایک ہیں۔ وہ بوریا نشین اور مسند نشین میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔

پیشِ قرآں، بندہ و مولا یکے است
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

حریت اسلامیہ

حریت اسلامیہ کے ثبوت میں کربلا سے بڑا واقعہ اور حضرت امام حسین علیہ السلام سے اونچا کردار اور کون ہو سکتا تھا لہذا اقبال نے اس واقعہ کو مختصر طور پر بیان کر کے بتایا ہے کہ اسلامی تعلیم اور رسالت محمدیہ انسانی قلب میں حریت پسندی کے نہایت قوی جذبات پیدا کرتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے توحید کا جو تصور دلوں میں راسخ کرنے کی سعی فرمائی ہے اس کا بنیادی تقاضا یہی ہے کہ انسان ہر قسم کی ذہنی و جسمانی غلامی سے آزاد ہو جائے۔ اور سوائے اللہ تعالیٰ کے اس کے دل میں کسی کا خوف راہ نہ پائے۔ یزید بڑا طاقت ور حکمران تھا مگر جب اس نے خلافت کے اسلامی اصول پر ضرب کاری لگا کر اس کو خاندانی بادشاہت میں بدلنا چاہا تو امام حسینؑ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور اس کا ساتھ دینے سے قطعی انکار کر دیا۔ حکمران نے ہر قسم کے حربے، منت سماجت سے لے کر قتل و غارت کی دھمکی تک استعمال کئے لیکن حضرت امامؑ کی بے خوف اور حریت پسند طبیعت کے سامنے کوئی حربہ کارگر ثابت نہ ہوا۔ امام حسینؑ نے اپنے آپ کو اور اپنی ساری آل و اولاد کو قربان کر دیا لیکن ایک ایسے حکمران کے ساتھ تعاون نہ کیا جو حریت اور جمہوریت کی اسلامی تحریک کا دشمن ثابت ہو رہا تھا۔

اقبال نے حضرت امامؑ کی حریت پسندی اور مردانگی کو عشق سے تعبیر کیا اور کہا ہے کہ عشق اور حریت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حریت پسندی عشق و ایمان کی شرط اول ہے۔

عشق را آرامِ جاں حریت است   ناقہ اش را ساربان حریت است

زندگی میں دو ہی حقیقتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں، ایک سچائی: جمہوریت اور

حریت کی قوت ہے اور دوسری وہ طاقت ہے جو ہر دم ان اقدار کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ ابراہیم و نمرود، موسیٰ و فرعون اور شبیرؓ و یزید کے معرکے اسی ابدی کشمکش کے مختلف روپ ہیں۔

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید   ایں دو قوت از حیات آید پدید

اس کشمکش میں سچائی کی فتح و نصرت کا راز یہ ہے کہ حق پرست انتہا درجہ کے حریت پسند اور ایثار پیشہ ثابت ہوئے ہیں۔ وہ انسانی قدروں کو اپنے لہو سے سینچتے اور اپنی جان دے کر حق کی حفاظت کرتے ہیں

زندہ حق از قوت شبیری است   باطل آخر داغ حسرت میری است

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است   پس بنائے لا الہ گردیدہ است

مختصر یہ کہ اسلام اور حریت مترادف الفاظ ہیں کیونکہ مسلمان وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی طاقت کے آگے سر نہیں جھکاتا۔ وہ مجسم حریت ہے۔

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

باب ۱۲

ملّتِ اسلامیّہ کی خصوصیات

نہایتِ مکانی ندارد

توحید اور رسالت کی حقیقت و اہمیت واضح کرنے کے بعد اقبال نے کئی ابواب میں ملتِ اسلامیہ کے امتیازات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں پہلی بات جو انہوں نے بیان کی یہ ہے کہ ملتِ محمدیہ چونکہ توحید اور رسالت پر استوار ہے، لہٰذا وہ کسی ملک، کسی وطن یا کسی خطۂ ارضی کے ساتھ محدود و مختص نہیں۔ جب توحید لامکانی ہے۔ جب رسالت محمدیہ کا پیغام ساری دنیا اور تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے تو پھر جو قوم ان بنیادوں پر اپنے آپ کو استوار کرے گی وہ خود کو حدودِ مکانی کی پابند کیوں کر بنا سکتی ہے۔

اس بنیادی دلیل کے علاوہ اپنے نقطۂ خیال کے حق میں اقبال نے تین دلائل اور بیان کئے ہیں۔ اور ان سب کا تعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ قصیدہ بانت سعاد عربی زبان کے نہایت بلند پایہ قصائد میں شمار ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ حضرت کعبؓ بن زہیر نے رسول کریمؐ کی شان میں لکھا تھا۔ اس کے لکھے جانے کا سبب بڑا دلچسپ ہے۔ کعبؓ نواحِ مکہ کے رہنے والے اور رسول کریمؐ کے ہمعصر تھے۔ جب آپؐ نے تبلیغِ اسلام کا آغاز کیا تو وہ دشمنانِ اسلام کے حلقہ میں شامل ہو گئے اور آپؐ

کو طرح طرح سے ایذا پہنچاتے رہے۔ فتحِ مکہ کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا تو انہیں اپنی غلطیوں کا شدید احساس ہوا۔ پہلے تو وہ جان بچانے کی خاطر مکہ سے بھاگ کر طائف چلے گئے۔ اور پھر جب ان کے دل میں ایمان کی چنگاری روشن ہوئی تو انہوں نے ایک پرتاثیر قصیدہ حضور نبی کریمؐ کی تعریف میں لکھا اور حاضرِ خدمت ہو کر معافی کی درخواست کی۔ حضورؐ نے ان کو معاف کر دیا اور قصیدے کے صلے میں اپنی چادر مبارک عطا فرمائی۔ اس قصیدے میں ایک جگہ کعبؓ نے نبی کریمؐ کو ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار (من سیوف الہند) کے الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ آپؐ نے کعبؓ کے مصرع میں اصلاح دے کر فرمایا من سیوف اللہ (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کہنا چاہیئے۔

اقبال نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے یہ صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ رسولِ کریمؐ اپنی ذات اور اپنے پیغام کو چونکہ کسی خاص ملک یا کسی ایک خطۂ زمین تک محدود نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اپنے کو کسی ایک ملک سے منسوب کیا جانا آپ کو پسند نہ آیا۔ ملّتِ اسلامیہ کی بھی یہی صورت ہے جب اس کا پیغمبر کسی خطے سے منسوب نہیں تو وہ بھی کسی علاقے تک محدود نہیں۔

دوسری دلیل ایک حدیث سے لی گئی ہے۔ ایک بار آپؐ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا "تمہاری دنیا کی تین چیزیں مجھے بہت مرغوب ہیں۔ خوشبو، بیویاں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز" اقبال نے "تمہاری دنیا" پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان الفاظ سے دنیا اور دنیا داری سے ایک طرح کی بے نیازی یا بالاتری کا اظہار ہوتا ہے۔ حضورؐ اخلاقی اور روحانی امور کو مقدم سمجھتے تھے۔ آپ دنیا کی اچھی چیزوں کی اگرچہ قدر کرتے تھے اور ان کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپ کی زبانِ مبارک سے

دنیا کے لئے "تمہاری دنیا" کے الفاظ کا ادا ہونا نہایت معنی خیز ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مومن ارضیت میں پھنس کر نہیں رہ جاتا۔ اس کے فکر و عمل کا دائرہ پوری کائنات کو محیط ہے۔

تیسری دلیل ہجرت سے لی گئی ہے۔ ہجرت کے فلسفہ و حکمت پر اقبال نے ایک سے زیادہ مرتبہ اظہار خیال کیا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مکہ میں جب مسلمانوں کا رہنا نہایت دشوار ہو گیا اور کفار کی ایذا دہی اپنی حد کو پہنچ گئی تو رسول کریمؐ نے ہجرت اختیار فرمائی۔ اقبال کہتے ہیں تم نے ہجرت کی حقیقت و حکمت پر غور نہیں کیا اور اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ حضورؐ نے جان بچانے کی خاطر ہجرت کی تھی حالانکہ آپ کی جان کی حفاظت کا وعدہ تو قرآن حکیم میں پہلے ہی ہو چکا تھا پھر آپؐ کو جان بچانے کی خاطر مکہ چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ دراصل ہجرت فرما کر پیغمبر اسلام یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ان کا دین وطنیت کا پابند نہیں ہے۔ مکہ آپؐ کا وطن اور مرزبوم تھا لیکن جب اس نے دین اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تو ہجرت فرما کر پیغمبر اسلام نے وطن پر دین کی فوقیت و برتری کا ثبوت پیش کیا۔ آپ کے نزدیک دیس کے مقابلے میں اصول حیات (دین) زیادہ قیمتی اور انسان کی وفاداریوں کا زیادہ مستحق تھا۔ ہجرت کا فلسفہ یہ ہے کہ مسلمان کی نظر میں دین کے سامنے وطن، عزیز و اقارب اور دنیاوی مال و دولت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ دین دنیا کی ہر شے پر مقدم ہے۔ رسول کریمؐ نے محض حالات کی ناسازگاری کی بنا پر ہی ہجرت فرمائی ہوتی تو حالات سازگار ہونے پر یعنی فتح مکہ کے بعد آپ وطن واپس آ جاتے اور اسی کو حکومت اسلامیہ کا صدر مقام بناتے مگر آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ آبائی وطن پر اس شہر کو ترجیح دی جس نے آڑے وقت میں اسلام قبول کیا تھا۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمان کو قیدِ مقام سے آزاد رہنا چاہیئے۔ ملتِ اسلامیہ کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ وطنیت کی پابند نہیں۔ اس خیال کو اقبال نے ایک تمثیل کی مدد سے بھی بیان کیا ہے جس طرح مچھلی سارے دریا کو اپنا گھر سمجھتی ہے اور دریا کے کسی ایک حصے کو اپنے لئے مخصوص نہیں کر لیتی اسی طرح مسلمان بھی ساری دنیا کو اپنا گھر سمجھتا ہے[1]۔ اس کی ہمدردیوں کا دائرہ کسی خاص خطّے تک محدود نہیں ہو سکتا۔

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو　　　　یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

اس خیال کو انہوں نے اپنی مشہور اردو نظم "وطنیت" میں یوں ادا کیا ہے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی　　　　رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی　　　　دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اس نظم کا آخری بند یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ اقبال کی نظر میں جدید قسم کی وطنیت کس درجہ انسان دشمن ہے اس کا اندازہ ذیل کے بند سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ یہ نظم انہوں نے انگلستان سے واپسی کے تھوڑے ہی عرصے بعد لکھی تھی۔ اس کا زمانہ تحریر ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ ہے۔ بعد کی دو خوفناک عالمگیر جنگوں نے اقبال کے خیال کی پوری پوری تصدیق کر دی ہے۔ بند یہ ہے۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　　　تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے

---

[1] ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مکیاولی

رموز کے تیرھویں باب میں اقبال نے نظریۂ وطنیت کے آغاز اور مقبولیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مکیاولی (۱۴۶۹ء - ۱۵۲۷ء) پہلا شخص تھا جس نے یورپ میں جدید قسم کی مملکت کا تصور پیش کیا۔ اٹلی کے اس مصنف نے بادشاہوں پر زور دیا کہ مذہب اور مذہبی طبقے کا اثر زائل کر کے خالص سیکولر قسم کی ریاستیں قائم کی جائیں۔ اس نے شہزادوں کو قوت اور تشدد سے کام لینے کا مشورہ دیا اور ان کی مطلق العنانی کے لئے یہ جواز پیش کیا کہ اس کے بغیر ملک اور ریاست کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کے نزدیک حکمرانوں کی سخت گیری ملک کے استحکام کی شرطِ اول ہے۔ جوں جوں یہ تصورات یورپ کے حکمران طبقے میں مقبول ہوتے گئے وطن کا مادی تصور زور پکڑتا گیا اور عیسائیت کی گرفت دلوں سے کمزور پڑتی گئی۔ حتیٰ کہ وطنیت نے مذہب کی جگہ لے لی اور اخلاق کو سیاست سے الگ کر دیا گیا۔ اقبال نے مکیاولی کے متعلق کہا ہے کہ وہ شیطان کا بھیجا ہوا ایک مرسل تھا جس نے محبت و اخوت کے پیمانے توڑ ڈالے اور اجتماعی اخلاق کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اس نے قوموں کو وطن کی خالص مادی بنیاد پر اٹھایا۔ اس سے انسانی برادری اور برابری کا تصور مٹ گیا اور بنی آدم متصادم گروہوں اور قبیلوں میں بٹ گئے۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند　　بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند　　نوعِ انساں را قبائل ساختند

جب انسانی برادری قبائل میں بٹ گئی تو انسان انسان کا دشمن بن گیا۔ اور دلوں میں نفرت کی آگ سلگنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانیت تو رخصت ہو گئی اور صرف اقوام باقی رہ گئیں۔

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

اس صورتِ حال کا علاج ملّتِ اسلامیہ کے پاس ہے جو قیدِ مقام سے آزاد ہے وطنیت کے بت کی پرستار نہیں، جو گورے کالے، عراقی شامی اور مصری و یونانی میں کوئی فرق روا نہیں رکھتی جس کے نزدیک روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان خدا کی یکساں مخلوق ہیں اور جو نسلِ آدم کو ایک کنبہ اور ایک برادری خیال کرتی ہے۔

قیدِ زماں سے بھی آزاد ہے

ملّتِ اسلامیہ کے متعلق دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس طرح مکانی لحاظ سے اس کی کوئی حد، کوئی نہایت نہیں۔ اس طرح زمانی لحاظ سے بھی اس کی کوئی حد، کوئی انتہا نہیں۔ یہ ملّتِ شریفہ قیامت تک کے لئے زندہ و پائندہ ہے۔ دنیا کا کوئی حادثہ، تاریخ کا کوئی سانحہ اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا نہیں سکتا۔ اس کے لئے اقبال نے قرآن اور تاریخ سے استدلال کیا ہے۔ قرآن حکیم کے متعلق ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ "یہ ذکر" ہم نے نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت خود ہمارے ذمے ہے[1]۔ جب قرآن حکیم قیامت تک کے لئے زندہ ہے تو جو قوم اس کی حامل ہے اور جس کے ذریعے قدرت نے اس

---

[1] اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

کی حفاظت کا انتظام کیا ہے وہ کیونکر مٹ سکتی ہے۔ مسلمان قوم کا مٹنا قرآن کی بقا کے منافی ہے لہٰذا ملتِ اسلامیہ ہمیشہ رہے گی۔[1]

اسی طرح قرآن حکیم میں کفر و اسلام کی باہمی آویزش کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔ "کفار اللہ کے نور (یعنی دینِ اسلام) کو بجھانے کی فکر میں ہیں لیکن اللہ تعالےٰ ان کی آرزوؤں کے خلاف اس نور کو بڑھائے گا اور مکمل کرے گا۔"[2] یہ آیت بھی اس امر کی دلیل ہے کہ کفر و ایمان کی ابدی کشمکش میں ایمان بازی نہیں ہارے گا۔ نورِ اسلام کا باقی رہنا بلاشبہ ملتِ اسلامیہ کی بقا پر دلالت کرتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے دوام کو اس زاویے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ توحید ہمیشہ رہنے والی حقیقت ہے۔ پھر جو قوم اس حقیقت کی حامل اور علمبردار ہے اس کے دوام میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس دلیل کو اقبال نے "شکوہ" میں کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ع

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

تاریخ سے یوں استدلال کیا گیا ہے کہ جیسی جیسی کڑی آزمائشوں سے مسلمان قوم گزری ہے ویسی آزمائشوں میں پڑنے سے دنیا کی کوئی دوسری قوم باقی نہیں رہی مگر مسلمان باقی ہیں۔ اس سے کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے؟ مثال کے طور پر فتنۂ تاتار کو دیکھئے۔ ہلاکو خاں

---

[1] "طلوعِ اسلام" میں اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا!

خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے! (بانگِ درا: ۳۰۶)

[2] يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ ... وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

کے ہاتھوں جس طرح بغداد کی اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی، اس تباہی کا منظر دیکھنے والا کوئی مبصر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسلام زندہ رہے گا یا مسلمان قوم بہ حیثیت قوم باقی رہے گی لیکن زمانے نے دیکھا کہ مسلمان اس آزمائش سے بھی گزر گئے۔ فاتح قوم اسلام کی حکمت و صداقت سے خود مفتوح ہو گئی۔ اور

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس کے مقابلے میں رومی، ساسانی، یونانی اور مصری تہذیبوں کا حال دیکھو۔ ایک زمانے میں ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ ان سے بڑے بڑے کارنامے انجام پائے لیکن آزمائش کا وقت پڑنے پر وہ موت کی دستبرد سے نہ بچ سکیں اور اب ان کے صرف کھنڈر باقی ہیں۔ رومیوں کی گرم بازاری اور جہانگیری کا خاتمہ ہو گیا۔ ساسانیوں کا شیشۂ اقتدار ٹوٹ گیا۔ خمخانۂ یونان کی رونق باقی نہ رہی اور مصری تہذیب کی ہڈیاں تو اہرام دب کر خاک ہو گئیں لیکن ملت اسلامیہ سنگین امتحانوں کے باوجود زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

رومیاں را گرم بازاری نماند — آن جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
در جہاں بانگِ اذاں بود ست و ہست — ملتِ اسلامیاں بود ست و ہست

آخر میں اقبال نے ملت اسلامیہ کی بقا کے حق میں ایک اور دلیل پیش کی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کیوں قید زماں سے آزاد ہے؟ اقبال کے نزدیک اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ یہ دنیا، یہ نظام ہستی عشق و محبت کی بدولت قائم ہے اور عشق ہمارے سوزِ دروں، سوز ایمان سے زندہ ہے لہذا اس دنیا کی بقا کے لئے ہماری بقا ضروری ہے، لابدی ہے۔

عشق آئینِ حیاتِ عالم است — امتزاجِ سالماتِ عالم است

عشق از سوزِ دل ما زندہ است　　　از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

نصب العینِ ملت

ملتِ اسلامیہ کے متعلق تیسری بات پہلی دو باتوں سے بھی زیادہ اہم اور اساسی ہے اس کا تعلق ملی نصب العین سے ہے۔ ہر قوم اپنے سامنے ایک نہ ایک نصب العین رکھتی ہے۔ مثلاً آج کل کی وطن پرست قومیتوں کے پیشِ نظر اپنی اپنی قوت اور سربلندی ہے روس کا مقصد ملک روس کو زیادہ سے زیادہ طاقت ور بنانا اور امریکہ کا مقصد سرزمینِ امریکہ کو زیادہ سے زیادہ قوی اور با اثر دیکھنا ہے۔ یہی حال دنیا کی دیگر اقوام کا ہے۔ ہر قوم اپنی اپنی خوشحالی کے لیے کوشاں ہے۔ اس لحاظ سے دنیا کی اقوام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جو اپنی خوشحالی اور روزگار کے لئے کمزور قوموں کو اپنا محکوم بنانے اور بنائے رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور دوسری وہ جو طاقتور قوموں کی غلامی یا بالادستی سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو طاقتور کیا اور کمزور کیا وطن کی بنیاد پر اٹھنے والی تمام قومیں ذاتی نہیں تو اجتماعی خود غرضیوں اور تنگ نظریوں کی ضرور شکار ہیں۔ اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کی مدد بھی کرتی ہے اور اس کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے تو اس جذبۂ امداد کی تہ میں بھی انسانی ہمدردی اور حسنِ نیت سے زیادہ سیاسی مصلحتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ امریکہ کی امداد روسی بلاک کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کا دوسرا نام ہے اور روس کی دوستانہ معاونت اینگلو امریکی گروہ کے اثر کو ختم کرنے کا ایک بہانہ ہے۔

مختصر یہ کہ جہاں تک اجتماعی اور قومی زندگیوں کا تعلق ہے وسیع انسانی ہمدردی محبت و
اخوت اور عدل و انصاف کے وہ اوصاف جن سے حقیقت میں انسانیت عبارت ہے۔
اور جس کی بدولت انسان اور حیوان میں تمیز کی جاتی ہے، نسلِ آدم سے اٹھتے جاتے ہیں اور
ان کی جگہ دلوں میں نفرت و رقابت کی آگ سلگ رہی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ ان نصب العینوں پر عائد ہوتی ہے جو
آج کل کی قومیتوں نے اپنے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ انسانی زندگی میں خواہ وہ انفرادی ہو
یا اجتماعی نصب العین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصے میں قدرے
تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ ہمارے نصب العین ہمارے فکر و عمل کے رہنما ہیں اور اپنی پستی و
بلندی کے مطابق ہمارے ظرف و کردار کو پستی و بلندی عطا کرتے ہیں۔ انسان کے دل و دماغ
کے لئے نصب العین کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم کے لئے گردشِ خون یا حرکتِ قلب کی
ہے۔ جس طرح گردشِ خون کا رک جانا یا حرکتِ قلب کا بند ہو جانا انسانی جسم کی موت ہے۔
اسی طرح اعلےٰ نصب العین کا مفقود یا نظروں سے اوجھل ہو جانا انسانی دل و دماغ کی موت
ہے اور جس طرح خون میں فساد کا پیدا ہونا یا حرکتِ قلب کے توازن کا بگڑ جانا انسانی جسم کو
بیمار یا لاغر کر دیتا ہے اور اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اسی طرح ادنےٰ درجے کے
نصب العین انسانی فکر و اخلاق کو مریضانہ اور سقیم بنا دیتے ہیں۔

اس لحاظ سے دیکھئے تو دنیا کی کوئی قوم اور کوئی تہذیب ملتِ اسلامیہ سے زیادہ
خوش نصیب اور بلند بخت نہیں ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا نصب العین توحید کی حفظ و اشاعت
ہے، بہ حیثیت ایک امت اور ایک جمعیت کے مسلمان نہ تو کسی ایک گوشۂ ارض کو زیادہ سے
زیادہ طاقتور اور زیادہ سے زیادہ خوشحال دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ اور نہ وہ کسی ملک

کی سامراجیت تمام کرنے کے درپے ہیں۔ ان کا نصب العین ہی اور ہے۔ وہ خدا کی زمین پر خدا کی وحدانیت کے اصول کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت سے آگاہ ہو کر اپنی زندگیوں کو اصولِ کائنات سے ہم آہنگ کر لیں تاکہ ان کے دلوں میں نسلی امتیازات اور قومی تعصبات کے دہکتے ہوئے شعلے سرد ہو جائیں۔ ان کے سینے محبت و مروت کے نور سے جگمگا اٹھیں۔ ان میں انسانی اخوت اور مساوات کا احساس پیدا ہو۔ وہ سب انسانوں کو ایک خدا کی مخلوق سمجھ کر اپنی زندگیوں کو وسیع انسانی ہمدردی اور محبت کے اصول پر استوار کریں اور اپنے اخلاق کو پاکیزہ بنائیں۔

رموز کے بیسویں باب میں اقبال نے پیشِ نظر موضوع سے بحث کی ہے۔ اس باب کے دو بند ہیں پہلے بند میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ قوم میں حقیقی جمعیت اور اتحاد کی روح نصب العین سے افراد کی گہری وابستگی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ افراد کے دلوں میں نصب العین کی گرفت جس قدر محکم ہوگی، قوم کے اندر قومیت کا جذبہ اسی قدر مضبوط اور گہرا ہوگا۔ قوم کی زندگی کے لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ نصب العین ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو کیونکہ نصب العین کی گرمی ہی ان کے دست و پا میں حرکت و تیزی پیدا کرتی ہے اور ان کی صد چشم کو یک نظر بناتی ہے۔

دوسرے بند میں اقبال نے توحید کے نصب العین کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے۔ توحید کی نعمت انسانوں کو بیٹھے بٹھائے اور بغیر آرزو اور کوشش کے حاصل نہیں ہوئی۔ لاکھوں برس تک زندگی اپنے حقیقی اور سچے نصب العین کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی رہی۔ عناصر کے امتزاج سے پیدا ہونے والی دنیا میں ایک طویل مدت کے بعد جب حیات نمودار ہوئی تو لاتعداد

صدیوں تک اس کا قدم حیوانات سے آگے نہ بڑھا۔ اس کے بعد انسان نمودار ہوا لیکن وہ حیوانوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ ایک مدتِ طویل کے بعد اس نے بولنا سیکھا۔ اس کے بعد سوچنے سمجھنے اور لکھنے پڑھنے کی باری آئی۔ پھر علم وفن کا آغاز ہوا لیکن حقیقی منزل کا نشان ابھی کہاں ملا تھا۔ انسان ابھی بت پرستی، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی اور مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش میں کھویا ہوا تھا۔ جن اللہ کے بندوں نے نوعِ انسانی کو اس کے سچے نصب العین سے آگاہ کیا۔ انہیں بڑے بڑے دکھ اٹھانا پڑے۔ بہتوں نے وطن چھوڑا سر بصحرا نکل کھڑے ہوئے۔ جنگیں لڑیں، زخم کھائے۔ نمرودوں اور فرعونوں سے ٹکر لی۔ سینکڑوں نے اس راہ میں جان تک دے دی۔ جب کہیں انسانوں پر توحید کی حقیقت آشکار ہوئی۔

لیکن وہ انسان جو صدیوں تک بت گری اور بت پرستی کا عادی رہا ہے۔ اس کے ذہن کی یہ کجی اب بھی باقی ہے۔ عہدِ حاضر میں اس نے ایک اور بت تراش لیا ہے۔[۱] یہ بت دیوی دیوتاؤں کا پیکرِ محسوس ہونے کی بجائے رنگ اور ملک و نسب کا بت ہے۔ جس کے ہاتھوں آدمیت کا دامن تار تار ہے اور انسانیت تباہ حال ہے۔ ان حالات میں ملّتِ اسلامیہ پر نہایت عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

یہاں اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں تم نے مینائے خلیل سے شرابِ توحید

---

[۱] فکرِ انساں بت پرستے بت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نامِ اُو رنگ است وہم ملک و نسب

پی ہے اور تمہارے خون میں ابراہیمی ایمان کی گرمی و حرارت ہے پھر تم باطل کا چیلنج کیوں قبول نہیں کرتے اور سوائے اللہ کے اور کوئی موجود نہیں، کی تلوار سے کیوں کام نہیں لیتے۔ عالم انسانی ان تصورات کی محتاج ہے جو خدائے تعالیٰ نے قرآن حکیم کی صورت میں تم پر مکمل کر دیئے ہیں۔ پھر تم اس نعمت کو کیوں عام نہیں کرتے ہو؟ اتحادِ آدم کا جو نسخۂ اکسیر تمہارے پاس ہے اس کا فیضان کب عام کرو گے؟ اٹھو اور اپنے نصب العین کی بدولت زمانے کی تاریکی کو روشنی میں بدل دو۔

آخر میں کہتے ہیں جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ روزِ حساب رسول کریم مسلمانوں سے یہ دریافت کریں گے کہ تم نے جو سچائی اور صداقت ہم سے پائی تھی اسے دوسروں تک کیوں نہیں پہنچایا تو میں ان کی شرمساری کے احساس سے لرز جاتا ہوں۔

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار
پرسدت آں آبروئے روزگار
حرفِ حق از حضرتِ ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

باب ۱۳

قرآن آئینِ ملّت ہے

توحید و رسالت اور ملّت اسلامیہ کی خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد اقبال نے رموز کے پندرھویں باب میں قرآنِ حکیم کی حیثیت سے بحث کی ہے۔ باب کا عنوان ہے۔ "درمعنیٰ ایں کہ نظامِ ملّت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئین ملّتِ محمدیہ قرآن است" (قوم کا نظام بغیر آئین کے استوار نہیں ہوتا اور ملّتِ اسلامیہ کا آئین قرآن ہے) ابتدا میں وہ آئین کی اہمیت و ضرورت پر بعض دلائل پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں پھول کی پتی پر غور کرو۔ جب پتیاں آئین کی پابندی کرتی ہیں تو پھول بن جاتی ہیں۔ پھول جب آئین اتحاد کے پابند ہوتے ہیں تو گلدستے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ آواز جب قانونِ موسیقی کی پابند ہو جائے تو نغمہ بن جاتی ہے مگر وہی آواز جب قانون کی پابندی ترک کر دے تو شور و غوغا ہو کر رہ جاتی ہے۔ قانون و آئین کی پابندی زندگی میں حسن و جاذبیت اور قوت و عظمت پیدا کرتی ہے قومیں بھی پھول اور آواز کی طرح ہیں۔ جب وہ آئین کی سختی سے پابندی کرتی ہیں تو مضبوط و سربلند ہوتی ہیں مگر جب وہ تارکِ آئین ہو جائیں تو اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہیں۔ ان کی قوت و شوکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اقبال مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں تمہیں معلوم ہے تمہارا آئین کیا

ہے؟ تمہاری عزت و آبرو کا راز کس میں ہے؟ اور پھر جواب دیتے ہیں، قرآن حکیم جو زندہ کتاب ہے جس کی حکمت لازوال ہے۔ جس کی صداقت میں بال برابر فرق نہیں آنے کا۔ جس کی سچائیاں ہمیشہ رہنے والی ہیں جس کے الفاظ میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے نہ ہو گی۔ جس کی آیات ابدی حقائق کی ترجمان ہیں۔ جس نے غلاموں کو آزاد کیا اور قیدیوں کو رہا کروایا۔ جو نوع انسانی کے نام خدا کا آخری پیغام ہے جسے رحمۃ للعالمین لائے۔ اس کتاب زندہ میں تیری حیات و نجات اور تیری عزت و آبرو ہے۔ یہ وہ آئینِ حیات ہے جس نے ایک منتشر اور اَن پڑھ گروہ کو ایک عظیم الشان قوم میں بدل دیا۔ اس نے رہزنوں کو رہبر اور ناخواندوں کو صاحبِ علم و بصیرت بنایا۔ اس کی بدولت ناتوان طاقتور اور بے کس صاحبِ اقتدار بن گئے۔

قرآن حکیم کی حکمت و ہدایت اور اس کی انقلاب آفرینی اور حیات بخشی پر لکھنے کے بعد اقبال اس بات پر اظہارِ حیرت و افسوس کرتے ہیں کہ ایسی کتاب کی موجودگی میں ایسے سرچشمۂ ہدایت کے پاس ہوتے ہوئے مسلمان رسوم و رواج اور شیوہ ہائے کافری میں گرفتار ہو گئے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے ان کی زندگی اور سربلندی فقط قرآن حکیم کی پیروی پر موقوف ہے جب تک وہ قرآن کو اپنا رہنما نہیں بنائیں گے گوہرِ حیات ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

باب کے آخر میں اقبال نے صوفی و واعظ پر دو دو تین تین شعر لکھے ہیں۔ صوفی جو کبھی محبت و اخوت اور ایثار و حمیت کا پیکر تھا آج خانقاہوں کے اندر انتہائی بے ذوق زندگی کاٹ رہا ہے۔ اس کے ایمان میں کوئی گرمی ہے نہ اس کے عمل میں کوئی شعلہ۔ وہ عراقی کے شعر اور قوال کے نغمے پر سر دھنتا ہے مگر اس کا دل آیاتِ قرآنی کے سوز سے خالی ہے۔ اس کی نگاہ خانقاہی نظام کی بدولت حاصل کی ہوئی نذر و نیاز سے آگے

نہیں دیکھ سکتی۔

واعظ و مبلغ کی حالت صوفی سے کسی طرح بہتر نہیں۔ اگر صوفی قوال کی تھاپ پر مست ہے تو واعظ افسانہ طرازی، اور داستان گوئی میں کھویا ہوا ہے۔ اس کے الفاظ زوردار مگر مطالب بے جان ہیں۔ وہ حدیث و فقہ کی دور از کار بحثوں اور بے معنی موشگافیوں میں رات دن گزارتا ہے اور زندگی کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔ اس کی زبان پر خطیب[1] و دیلمی کا چرچا اور ضعیف و شاذ و مرسل حدیثوں کا ذکر رہتا ہے۔ کاش اس کی زبان تلاوتِ قرآن کی حلاوت اور اس کا دل اسرارِ کتاب کی لذت سے آشنا ہوتا۔

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند　　معنیٔ او پست و حرفِ او بلند

از خطیب و دیلمی گفتارِ او　　با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ او[2]

صوفی و واعظ کے متعلق اپنے انہی خیالات کو اور امت کے حق میں ان کے اس طرزِ عمل سے جو تباہ کن نتیجہ برآمد ہوا ہے اس کو وہ اپنی مشہور نظم "ساقی نامہ" (بالِ جبریل) میں یوں بیان کرتے ہیں۔

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب　　مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

. . . .

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد　　محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

---

[1] خطیب ایک مورخ ہیں اور دیلمی ایک محدث [2] ضعیف و شاذ و مرسل۔ حدیث کی قسمیں ہیں۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ امت روایات میں کھو گئی

بالآخر ایمان کا شعلہ سرد پڑ گیا اور قرآن کو چھوڑ کر مسلمان جس روایات پرستی یا خرافات پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے اس نے ان کی تمام تاب و توانائی سلب کر لی۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

رموز کے علاوہ بھی اقبال نے کئی جگہ قرآن حکیم کی حکمت و عظمت پر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ہم مثنوی مسافر (۱۹۳۵ء) سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۳۳ء کی بات ہے کہ افغانستان کے موجودہ حکمران شاہ ظاہر شاہ کے والد مرحوم و مغفور نے اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو اپنے ہاں کے نظام تعلیم کے بارے میں مشورے کے لئے کابل آنے کی دعوت دی۔ شاہ افغانستان سے اقبال کے دیرینہ مراسم تھے اور دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ مثنوی "مسافر" اقبال کے اس سفر افغانستان کے تاثرات کا بیان ہے۔ اقبال جب لاہور سے چلے تو شاہ "درویش خو" کے لئے قرآن مجید کا ایک نسخہ بغرض ہدیہ ساتھ لے گئے۔ اس ہدیے کو پیش کرنے کی تقریب کا حال انہوں نے "مسافر" میں ایک جگہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں جب میں نے قرآن حکیم بطور ہدیہ شاہ کے پیش کیا تو کہا: "اہل حق کی یہی دولت و ثروت ہے۔ اس کے باطن میں حیات مطلق کے سوتے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتداء کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اس کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام کی تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔

گفتم ایں سرمایہ اہل حق است　　　در ضمیر او حیات مطلق است

اندرو ہر ابتدا را انتہاست　　　حیدر از نیروئے او خیبر کشا است

نشۂ سرِ غم بخون او دوید　　　دانہ دانہ اشک از چشمش چکید

شاہ نادر خاں غازی مرحوم بھی قرآن کے عاشقِ صادق اور اس کے محرمِ اسرار تھے ان کا جواب بھی کچھ کم ایمان افروز نہیں ۔ شاہ نے ہدیہ قبول کرتے ہوئے بتایا کہ جب وہ جلاوطن تھے اور کوہ و صحرا میں غمزدہ وقت کاٹ رہے تھے جب ان کے پاس زندگی کے وسائل کی کمی اور مادی طاقت کا فقدان تھا جب ان کا کوئی ساتھی اور غمگسار نہ تھا تو یہی کتاب ان کی رفیق رہنما اور ہمدرد و غمخوار تھی ۔ اسی قرآن کی بدولت انہوں نے زندگی کی ہر مشکل پر قابو پایا اور اپنے راستے کی ہر دشواری کو دور کیا ۔

گفت نادر در جہاں بے چارہ بود　　　از غمِ دین و وطن آوارہ بود

کوہ و دشت از اضطرابم بے خبر　　　از غمانِ بے حسابم بے خبر

نالہ با بانگِ ہزار آمیختم　　　اشک با جوئے بہار آمیختم

غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود

قوتش ہر باب را بر من کشود

باب ۱۴

ملّتِ اسلامیہ کا مستقبل

اس باب میں ہم اقبال کے ان افکار و خیالات کو بیان کریں گے جو انہوں نے قرآنِ حکیم کو آئینِ ملّت قرار دینے کے بعد ملّتِ اسلامیہ کی ترقی و استحکام کی خاطر پیش کئے ہیں اور جن کی پابندی ان کے نزدیک مسلمانوں کے مستقبل کو ان کے ماضی کی طرح شاندار اور تابناک بنا سکتی ہے۔

(۱) تقلید و تجدد میں توازن

ہمارے درمیان انقلابی بھی پیدا ہوئے ہیں اور رجعت پسند بھی۔ ایک گروہ نے فوری اور وسیع تبدیلیوں پر زور دیا ہے اور دوسرے نے ہر قسم کی تبدیلی و ترقی کی مخالفت کی ہے۔ اس معاملہ میں بھی اور بہت سے معاملات کی طرح، اقبال اعتدال اور توازن کے حامی تھے وہ نہ جدید نظریات کے تمام تر مخالف تھے اور نہ قدیم کے سر بسر حامی و پرستار۔ ان کی نظر ہمیشہ قوم کی اخلاقی اور نفسیاتی ضرورتوں پر رہی ہے۔ وہ صرف مقصد ہی نہیں، حصولِ مقصد کے ذرائع پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ بے شمار ذہنی اور معاشرتی تبدیلیوں کے خواہاں تھے مگر وہ اس راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے قائل تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جس سیاسی صورتِ حالات سے ترکی عظیم کے مسلمان دوچار تھے۔ وہ غالباً دنیا بھر کی قوموں

یں انوکھی تھی۔ دنیا کی بیشتر قومیں یا تو حاکم اور سامراجی تھیں یا پھر محکوم اور غلام۔ حاکم اور سامراجی قوموں کے سامنے اپنی قوت اور استحکام کو بڑھانے اور برقرار رکھنے کا مقصد تھا اور محکوم قومیں اپنے اندر وطن دوستی کی تحریکیں مقبول بنا رہی تھیں اور جنگِ آزادی کے لئے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ہر قوم کا مسئلہ اپنی دشواریوں کے باوجود واضح اور صاف تھا لیکن برِعظیم کے مسلمانوں کا مسئلہ از حد پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا۔ ان کی ہستی بہ یک وقت دو سامراجوں میں گھری ہوئی تھی۔ ایک وہ جس کی قوت آشکار تھی اور دوسرا وہ جس کی قوت ابھی پوری طرح ظاہر نہ ہوئی تھی۔ ان کا مستقبل نہ صرف انگریز کی حاکمیت سے بلکہ ہندوؤں کی عام وطن پرست تحریک سے بھی خطرے میں تھا۔ اس صورتِ حالات کا جیسا کچھ احساس اقبالؒ کو تھا سر سید کے بعد شاید ہی کسی اور مسلمان رہنما کو ہوا ہوگا۔ اس احساس اور ضرورت نے ان کو مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا بہت بڑا مبلغ اور علمبردار بنا دیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد و تصورات میں کوئی ایسی تبدیلی جو اس مرحلے پر ان کو انقلابی اور غیر انقلابی گروہوں میں بانٹ دے اور ان کی توجہ ملکی سیاست کے ٹھوس حقائق سے ہٹا کر فقہی تنازعوں میں الجھا دے نہایت خطرناک ثابت ہوگی۔ لہٰذا انہوں نے وہ اصول پیش کیا جو بغداد کی تباہی اور زوالِ امت کے بعد بعض دور اندیش علماء نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا یعنی زمانۂ انحطاط میں اجتہاد کے مقابلہ میں تقلید بہتر ہے۔

چنانچہ رموز کا سولھواں باب یہی عنوان رکھتا ہے۔ در معنیٔ ایں کہ در زمانۂ انحطاط تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است۔ اس باب میں سب سے پہلے انہوں نے نئی تہذیب کی اس روش کا ذکر کیا ہے جس کے باعث مسلمانوں کی نئی نسل اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلامی تاریخ سے ناواقف اور بے تعلق ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی مذہب سے بے تعلقی دراصل نئی

تہذیب کی مذہب سے بیزاری کا نتیجہ ہے لیکن مسلمانوں کو نئی تہذیب کا یہ اثر ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی زندگی اور مستقبل کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ ان کی سلامتی کا راز اس بات میں ہے کہ وہ اپنے نیک دل اور بلند سیرت بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں اور خواہ مخواہ کی جدت طرازیوں اور اجتہاد پسندیوں سے باز رہیں۔

انتشار اور زوال کے وقت اپنے اصولوں پر قائم رہنا اور قدیم روایات کی حفاظت کرنا ایسا ہی ہے جیسے خزاں کے دور میں کوئی شاخ فصلِ بہار کی امیدیں اپنے درخت سے وابستہ رکھے۔ قومی زندگی جب زوال آمادہ ہو اور اس کی قوت کے منتشر ہونے کا اندیشہ لاحق ہو تو تقلید کا نسخہ سب سے زیادہ کارگر ہے۔ تقلید میں کوئی عار نہیں، تقلید فرسودگی نہیں۔ یہ قوم کی جمعیت کو قائم رکھنے کا ایک قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ نظامِ ملت کی گرتی ہوئی دیوار تقلید کی بدولت سنبھل سکتی ہے۔

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنی تقلید ضبطِ ملت است

زوال کے وقت تقلید اس لئے ضروری ہے کہ ایسے نازک وقت میں اجتہاد قوم کی صفوں میں انتشار پیدا کرے گا اور اس کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جائے گی۔ ایسے کڑے وقت میں جب بڑے بڑوں کی عقل کا توازن قائم نہیں رہتا اپنے لئے نئے راستے تراشنا اور نئی قدروں کو اپنانا بڑی خطرناک روش ہے۔[1] تقلید میں ایک حد تک جمود کی کیفیت بے شک

---

[1] اجتہاد اندر زمانِ انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہادِ عالمانِ کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

پائی جاتی ہے مگر یہ جمود گمراہی سے بدرجہا بہتر ہے۔ تقلید آگے بڑھنے کی بجائے ایک ٹھہرؤ سہی لیکن یہ ٹھہراؤ قوم کو فنا ہونے سے بچالیتا ہے۔

یہاں اقبال نے مسلمانوں کے سامنے قوم اسرائیل کی مثال پیش کی ہے۔ کہتے ہیں اگر تم میں کچھ بصیرت ہے تو بنی اسرائیل کے احوال سے عبرت حاصل کرو۔ دیکھو! اس قوم کی جانِ ناتواں پر کیسے کیسے ظلم توڑے گئے۔ اسے کن کن آزمائشوں میں ڈالا گیا۔ اسے خون کی ندیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ اس نے ملک ملک کی خاک چھانی اور گھاٹ گھاٹ پر بسیرا کیا۔ آسمان کے ہاتھوں نے اسے انگور کی طرح نچوڑا مگر اس کے دل سے موسٰی و ہارون کی یاد نہ گئی۔ اس نے اپنی روایات اور اپنے تہذیبی سرمائے کو سینے سے لگائے رکھا یہ اس پختہ خیالی کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں سال کے جور و ستم کے باوجود یہ قوم زندہ ہے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھے ہوئے ہے (اقبال نے یہود کی پختہ خیالی کا ذکر اپنی بعض دوسری تحریروں میں بھی کیا ہے اور اس پختہ خیالی کی بدولت ۱۹۴۸ء میں یہود اپنی ایک خود مختار ریاست اسرائیل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے!)

مسلمان پر بھی زوال اور مصیبت کا وقت ہے۔ اگر اس نے پختہ خیالی اور یقین محکم سے کام نہ لیا تو اس کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اس کے پاس زندگی کی جو ٹھوس بنیادیں پہلے سے موجود ہیں وہ ان پر قائم رہے۔

(۲) اجتماعی کردار کی پختگی

افراد کا کردار کس طرح مضبوط اور محکم بنتا ہے، اس سوال پر اقبال "اسرار" میں خاصی بحث کر چکے تھے۔ اب ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ قومی کردار میں پختگی اور محکمی کا ذریعہ کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ دونوں سوال دراصل ایک ہی سوال ہے۔ جب افراد کی سیرت محکم

ہو جائے گی۔ تو ان کا مجموعی اور اجتماعی کردار خود بخود محکم ثابت ہو گا۔ اس کے باوجود علمی لحاظ سے ہر دو موضوع پر الگ گفتگو ممکن ہے۔ اقبال نے "رموز" کے سترھویں باب میں اس مسئلے کو موضوع قرار دیا ہے اور اس کے تحت ایک اہم اور قیمتی نکتہ کی بڑی عمدگی سے وضاحت کی ہے۔

زوالِ امت کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ اسلام جو ایک سیدھا سادہ اور عملی مذہب تھا عباسیوں کے عہد سے اس میں قدیم ایرانی اور یونانی تصورات کی آمیزش شروع ہو گئی اور بعض لوگوں نے دانستہ یا نادانستہ اپنی نازک خیالیوں اور فلسفیانہ موشگافیوں کی بدولت شریعت اسلامیہ کو ایک ایسا رنگ دے دیا جس کا قرآن کی تعلیمات اور دورِ صحابہؓ کی زندگی سے کچھ تعلق نہ تھا۔ ایک طرف حکماء کا فلسفیانہ ذوق خواص کو اسلام سے دور لے گیا۔ دوسری طرف بعض صوفیاء نے شریعت کے جو معنی اور مفہوم عوام میں رائج کئے وہ امت کے حق میں انتہا درجہ خطرناک ثابت ہوئے۔ انہوں نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ جس طرح ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن، ایک مغز ہوتا ہے اور ایک پوست۔ اس طرح مذہبِ اسلام کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ قرآن و حدیث کا ہر حکم ایک ظاہری معنے رکھتا ہے جو الفاظ پر غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتے ہیں مگر ایک اس کا باطنی مفہوم ہے جسے فقط اللہ کے خاص بندے اور اربابِ نظر ہی جان سکتے ہیں لہٰذا اسلام ایک نہیں بلکہ دو طریقِ زندگی کا نام ہے۔ ایک شریعت جو عوام کے لئے ہے اور جس میں دینی احکام کے ظاہری معنوں سے سابقہ پڑتا ہے اور دوسرا طریقت جس میں ظاہری معنوں کی پابندی لازمی نہیں۔ یہ خیال جوں جوں پھیلتا گیا۔ عوام کے دلوں سے شریعت کی محبت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ کمزور ہوتا گیا۔ اور ان میں تن آسانی سہل انگاری اور احکام کی تعمیل سے بچنے کا رجحان بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کے کردار

میں حد درجہ کا ضعف پیدا ہو گیا اور احکامِ شریعت کی پابندی کی بدولت ان کی سیرت میں جو عکمی اور سختی تھی وہ نرمی اور ناتوانی میں بدل گئی۔

دلوں سے احکامِ شریعت کی محبت اور گرفت کم ہونے اور ضعف کردار پیدا ہونے کے اسباب کی اس نشاندہی کے بعد اقبال نے نہایت زور کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ مذہبِ اسلام کوئی تہ دار شے نہیں کہ عوام کے لئے اس کی ایک صورت ہوا اور خواص کے لئے کوئی دوسری۔ اسلام سب کے لئے عقیدہ و عمل کا یکساں مسلک جس کا ظاہر اور باطن ایک ہے۔ مذہب میں باطنی مفہوم کو ڈھونڈھنا اور مختلف المعنوں کے لئے اس کی مختلف صورتوں کو روا رکھنا دراصل مذہب کی جڑ کاٹنا ہے۔ اسلام اس قسم کی تفریق اور امتیاز کا ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا سچے دین کی مثال ایک گوہر کی مثال ہے جس کا ظاہر بھی چمک ہے اور باطن بھی چمک۔ وہ سراپا روشنی، سراپا نور ہے۔ پس شریعت کے اندر دوسرے معنے تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے موتی سے چمک کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع رکھنا۔

در شریعت معنی دیگر مجو   غیرِ ضو در باطنِ گوہر مجو

لہٰذا مسلمانی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم شریعت پر جو اسلام کا دوسرا نام ہے سختی سے عمل پیرا ہوں اور اس کے احکام کی بجا آوری میں کسی قسم کی کمی یا کوتاہی نہ کریں۔ مسلمانوں کے لئے اجتماعی سیرت کو مضبوط بنانے اور موجودہ ضعفِ کردار کو دور کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

یہاں اقبال نے ایک فقہی اصول بیان کیا ہے۔ شرع کی اصطلاح میں سنت اس پسندیدہ عمل کو کہتے ہیں جس کا کرنا فرض کی طرح لازمی اور دائمی نہ ہو بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے

کا اختیار انفرادی مذاق اور میلان پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ جن علمائے سلف کو انسانی نفسیات اور اصولِ تمدن میں گہری نظر حاصل تھی۔ انہوں نے تمدنِ اسلامی کے استحکام کے لئے یہ اصول وضع کیا تھا کہ عام حالات میں جب کوئی امر مانع نہ ہو تو اس بات میں کچھ مضائقہ نہیں کہ ایک مسلمان مستحب کو اختیار کرے یا ترک لیکن اگر کوئی قوت، کوئی معاشرتی یا سیاسی عنصر راستے میں رکاوٹ بن جائے تو مستحب فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور مسلمانوں کی اجتماعی غیرت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس خاص مستحب کو اس طرح انجام دیا جائے گویا وہ ان پر از روئے شریعت فرض ہے۔ جماعت کی بقا اور اجتماعی کردار کی استواری کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس اصول کی حکمت و صحت سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔ شریعت کو عینِ اسلام ثابت کرنے کے بعد اقبال نے اس اصول کی طرف۔ ہماری توجہ مبذول کی ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ ہم شریعت کی پابندی میں اپنے آپ کو اس قدر مستعد کر لیں کہ فرض تو فرض مستحب بھی ہمارے دائرۂ عمل سے باہر نہ رہے۔ ایسے ہی پُرشوق طرزِ زندگی سے ہم ان کوتاہیوں کی تلافی کر سکتے ہیں جو خیالاتِ عجم کے زیرِ اثر ہماری زندگی میں در آئی ہیں۔

(۳) اجتماعی کردار کا حسن

یہ تو اجتماعی کردار کی پختگی اور محکمی کا بیان تھا لیکن صرف پختگی اور محکمی ایک اعلےٰ اور فیض بخش زندگی بسر کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے دلکشی اور دلنوازی کی بھی ضرورت ہے۔ محکم کردار کا انسان ہر مشکل پر قابو پالے گا اور ہر مہم سر کرے گا لیکن زندگی محض مہم سر کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا نام نہیں۔ اس میں نازک جذبات اور لطیف احساسات بھی ایک مقام رکھتے ہیں۔ یہاں خارجی مہموں کے ساتھ داخلی مہمیں بھی ہیں۔ اگر تاریخِ عالم

کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے لوگوں کے مقابلہ میں جنہوں نے اپنے زور و قوت سے آبادیاں فتح کیں اور زر و جواہر میں باج وصول کئے، ان لوگوں کی قدر و منزلت کہیں زیادہ ہے جنہوں نے اپنے حسنِ اخلاق سے دلوں کو مسخر کیا اور خاص و عام کی محبت و عقیدت کے حقدار ٹھہرے۔ اقبال ہزار قوت و محکمی کے قائل تھے مگر انہوں نے اس بات کو کسی مقام اور کسی مرحلے پر بھی نظر انداز نہیں کیا کہ ان کی مطلوبہ قوت حسنِ اخلاق اور تعمیری اقدارِ حیات کے تابع ہو یہی وجہ ہے کہ اگر رموز کے سترھویں باب میں انہوں نے اجتماعی کردار کی استواری پر گفتگو کی ہے تو اٹھارھویں باب میں سیرت کی دلکشی اور لطافت پر زور دیا ہے شریعت کے ایک ایک حکم پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی بدولت سختی اور قوتِ مقاومت پیدا ہوگی لیکن ضروری نہیں کہ اس سے ہمارا قومی کردار دوسری قوموں کی نظر میں محترم اور واجب العزت بھی ٹھہرے اور اگر ہماری سیرت واجب الاحترام نہیں ہوگی تو جن مقاصد کی تبلیغ کو ہم اپنے نصب العین قرار دیئے ہوئے ہیں اور جن اصولوں کی نشر و اشاعت کی خاطر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے دوسروں کے دل میں کوئی جگہ پیدا نہیں ہوگی۔ ہمارا کردار ہی ہمارے اصولوں کی تبلیغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لہذا سختی اور محکمی کے ساتھ ہم میں دلآویزی اور دلکشی بے حد ضروری ہے اور اس کے لئے ہمیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ رسولِ کریم کا اسوۂ حسنہ ہمارے لئے حسنِ سیرت کا کامل ترین نمونہ ہے۔ آپ کی ذات رحمت و رافت کا پیکرِ بے مثل تھی۔ آپ نے صرف دوستوں سے ہی تلطف نہیں برتا، دشمنوں سے بھی مروت اور عفو کا سلوک روا رکھا۔ آپ کی ہمدردی اور دلسوزی غیر محدود اور آپ کا جذبۂ خیر لامتناہی تھا۔

اس باب میں اقبال نے اپنے آغازِ جوانی کا ایک واقعہ بھی منظوم کیا ہے جس کا

ماحصل یہ ہے کہ نوجوان مسلمانوں کو اپنی زندگی کا نقشہ رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر تیار کرنا چاہیئے۔ کہتے ہیں کہ عنفوان شباب کا ذکر ہے ایک روز کسی فقیر نے دروازے پر یوں بیہم صدا لگائی کہ مجھے غصہ آگیا اور میں نے ایک چھڑی اس کے ماردی۔ والد بزرگوار کو جب میری اس حرکت کا علم ہوا تو ان کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مجھے پاس بلا کر کہا، قیامت کے دن جب امت کے غازی اور شہید، عالم اور زاہد، صوفی اور فقیہہ دربارِ نبوی میں جمع ہوں گے اور اس بھری محفل میں اگر یہ مظلوم فقیر ہماری بدسلوکی کی شکایت لے کر پہنچ گیا تو اندازہ کرو میری شرمساری کا کیا عالم ہوگا۔ اور اگر رسول کریمؐ نے فرمایا۔ اللہ تعالےٰ نے ایک نوجوان کی تربیت تیرے سپرد کی تھی۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اسے اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرتے۔ تو خیال کرو مجھ پر کیا گزرے گی۔ پھر فرمایا۔ اے میرے فرزند! مجھ پر یہ ظلم تو نہ کرو کہ کل مجھے اپنے آقا کے سامنے نادم ہونا پڑے۔ تم مسلمان ہو تو خلقِ محمدیؐ کا اتباع کرو مسلمان ہو کر اسوۂ حسنہ کی پیروی سے محروم رہنا زندگی کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ اس نصیحت کا اقبال کے دل پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ باپ کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ لرز اٹھے اور احساسِ ندامت نے اس کے حواس کھو دیئے۔

رفت لیلائے شکیب از محملم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ در تنم لرزید جانِ غافلم

باب کے آخر میں اقبال نے اتباعِ اخلاقِ محمدیؐ کے حق میں ایک اور دلیل پیش کی ہے ہر جاندار شے کا خاصہ ہے کہ وہ سازگار ماحول میں نشوونما پاتی ہے۔ ناسازگار فضائیں نہ صرف اس کی ترقی رک جاتی ہے بلکہ وہ رو بہ انحطاط ہو جاتی ہے۔ قطرۂ نیساں

کو آغوشِ صدف کی بجائے اگر غنچہ کا دامن نصیب ہو تو اس کا گوہر بننا معلوم! مسلمان کی فطرت کا گوہر اخلاقِ محمدی کے صدف ہی سے آب و تاب حاصل کر سکتا ہے۔

طینتِ پاکِ مسلماں گوہر است　　　آب و تابش از یمِ پیغمبر است

آبِ نیسانی درآغوشش در آ　　　وز میانِ قلزمش گوہر بر آ

تقلید و تجدد میں توازن اور اجتماعی کردار میں پختگی اور دلنوازی کے علاوہ اقبال نے تین اور باتوں پر زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک کا تعلق قومی اتحاد و یکجہتی سے ہے، دوسری کا تاریخ شناسی سے اور تیسری کا تعلق سائنسی علوم میں ترقی کرنے سے ہے۔

(۴) سائنسی علوم

سب سے پہلے سائنسی علوم کو لیجئے۔ مسلمان قوم چھٹی صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک بلاشبہ دنیا کی سب سے ترقی یافتہ، سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ متمدن قوم تھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سترھویں صدی سے اس پر ایسا زوال آنا شروع ہوا کہ اٹھارھویں انیسویں صدی میں بیشتر اسلامی ممالک یورپی اقوام کے محکوم ہو چکے تھے؛ زوالِ امت کے جو اسباب بھی گنوائے جائیں ان میں ایک اہم اور بنیادی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں جس قدر طبعی علوم کی طرف توجہ دی بعد میں وہ ان کی طرف سے اتنے ہی غافل اور بے گانہ ہو گئے! سائنسی علوم کی ترقی و ترویج میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ یورپ جب بے علمی اور اوہام پرستی کی تاریکیوں میں گھرا ہوا تھا اور یونان کے نظری علوم بھی ذہنوں سے محو ہو رہے تھے اس زمانے میں پہلے بغداد اور پھر اسپین کی یونیورسٹیوں میں مسلمان محققین اور علماء نے طب، ریاضی، فلکیات، کیمیا اور طبعیات کو بڑی ترقی دی۔ آج علم و تحقیق کے جس طریقے کو تجربی اور سائنسی طریقہ کہتے ہیں اس کی اختراع و دریافت

کا سہرا بھی مسلمان سائنسدانوں کے سر ہے۔

مسلمانوں نے نہ صرف یونان کے علم و حکمت کو عربی میں منتقل کر کے اور اس پر شرح و تنقید کا بے نظیر کارنامہ انجام دے کر یونان کے علمی سرمایہ کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کیا بلکہ عربی زبان کے ذریعے سائنسی علوم کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام کر کے اور راجر بیکن جیسے ہزاروں یہودی اور عیسائی طلبہ کو اپنی یونیورسٹیوں میں تعلیم دے کر گویا جدید یورپ کی داغ بیل رکھی۔ اس امر کو ایک نہیں بیسیوں مغربی مفکر اور محقق تسلیم کرتے ہیں کہ اگر سولہویں صدی میں یورپ عربی زبان سیکھ کر عربوں کے سائنسی علم سے حصہ وافر حاصل نہ کرتا تو جن تاریکیوں میں وہ گھرا ہوا تھا ان سے شاید آج تک نہ نکلا ہوتا۔ بری فولٹ (BRIEFAULT) اپنی مشہور کتاب تشکیل انسانیت (MAKING OF HUMANITY) میں عربوں کی سائنس دانی اور یورپ پر اس کے فیصلہ کن اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب و ثقافت نے جدید دنیا کی انجام دی ہے وہ سائنس ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے اسلامی ثقافت کے گہرے اثرات کا پتہ نہ چلے لیکن اس کا سب سے روشن ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ سائنس اور سائنسی طریقۂ تحقیق جو آج مغرب کی طاقت اور اقتدار کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے وہ عربوں ہی کی بدولت ہمیں حاصل ہوا۔"[1]

---

[1] تشکیل انسانیت صفحہ ۱۹۰

لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے سات آٹھ صدیوں تک سائنس اور علم و حکمت کے میدان میں اقوامِ عالم کی قیادت کرنے کے بعد مسلمانوں کے ذہن پر ایسی کہر چھائی کہ انہوں نے طبعی علوم سے منہ موڑ لیا۔ اور تحقیق و تدقیق کی بجائے تقلید و جمود کو اپنا شعار ٹھہرایا۔ برِعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں سرسید احمد خاں پہلے مصلح تھے جنہوں نے جدید علوم اور سائنس کی اہمیت کو سمجھا اور مسلمانوں میں ان کی تعلیم و ترویج کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن وسائل کی کمی کے باعث اور زیادہ تر محکوم زندگی کی مجبوریوں کے سبب ہم مسلمان سائنس اور صنعت کے میدان میں آگے نہ بڑھ سکے۔ ہم نے نئے علوم سیکھے بھی تو معاشرتی قسم کے مثلاً انگریزی زبان و ادب، فلسفہ تاریخ، نفسیات اور علم المعیشت وغیرہ۔ خالص سائنس میں ہم بدستور پس ماندہ رہے۔ ہماری تاریخ میں سرسید کے بعد اقبال دوسرے مفکر ہیں جنہوں نے سائنسی علوم سیکھنے کو نہ صرف مادی ضرورت قرار دیا بلکہ یہ کہا کہ سائنس میں ترقی کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا اور انہیں انسانیت کی خاطر کام میں لانا ازروئے قرآن ہمارا حق ہے اور نہایت مقدس فریضہ بھی، قرآن حکیم نے فطرت کے مختلف مظاہر کو قدرتِ خداوندی کی نشانیاں بتایا ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کی ہمیں بار بار دعوت دی ہے یہی نہیں بلکہ اس نے نہایت واشگاف لفظوں میں کہا ہے کہ یہ چاند اور سورج اور ستارے اور جو کچھ زمین و آسمان میں تمہیں دکھائی دیتا ہے یہ سب کچھ ہم نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے اندر مسخر ہونے اور ہمارے اندر تسخیر کرنے کی جبلی صلاحیت موجود ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم آگے بڑھیں اور علم کی قوت سے کام لے کر ان پر چھا جائیں اور ان کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیں۔ مغرب والوں نے یہی کچھ کیا ہے۔ اقبال نے جگہ جگہ مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے لیکن اہلِ مغرب نے علم و سائنس میں جس انہماک اور قابلیت کا ثبوت دیا ہے اقبال نے ہر موقع پر

اس کی داد دی ہے۔ ان کے تجزیے کے مطابق فرنگ کی قوت اس کے لباس یا مذہب سے بیزاری عیش پسندی یا ساقِ سیمیں کی نمائش کے باعث نہیں، علم وفن میں ان کے انہماک اور ترقی کی بدولت ہے۔ جاوید نامہ میں ایک مقام پر انہوں نے اس خیال کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست　　نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست
محکمی او را نہ از لادینی است　　نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست　　مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ　　مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست　　ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ درّاکے اگر داری بس است

اقبال کہتے ہیں علم وفن کا سچا ذوق ہمارا گمشدہ مال ہے اور مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل سائنسی علوم میں آگے بڑھے اور تسخیرِ حیات کا جو فرض ہم کئی صدیوں سے بھول چکے ہیں اسے پھر سے ہاتھ میں لے۔ مادی دنیا اس لئے نہیں کہ ہم اسے خیالی اور غیر حقیقی سمجھ کر اس سے بے تعلق رہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اسے تسخیر کریں اور صاحبِ اختیار بنیں۔

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس　　سینۂ او عرضۂ تیر است و بس
جستجو را محکم از تدبیر کن　　انفس و آفاق را تسخیر کن

وہ مسلمانوں کی نئی نسل کو اس کے مقام و منصب کی یاد و احساس دلاتے ہیں۔ عالمِ اسباب سے کنارہ کشی خودکشی کے برابر ہے۔ وہ تو ہے ہی اس لئے کہ مردِ مسلمان اس کی بدولت اپنی ذات کو وسعت دے اور اپنے حلقۂ اختیار کو بڑھائے۔ ہماری بے بضاعتی اور تنگ دامنی کا علاج اس میں پوشیدہ ہے کہ ہم علم و فن کے ذریعے عالمِ محسوس کو اپنے قابو میں لائیں۔

خیــز و واکن دیدۂ مخمور را　　　دوں مخواں ایں عـالمِ مجبور را

غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است　　　امتحانِ ممکناتِ مسلم است

غنچہ؛ از خود چـمن تعبیر کن　　　شبنمی؛ خورشید را تسخیر کن

اور امر واقعہ یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی موجودہ پستی اور پسماندگی کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم غلط خیالات کی دنیا سے نکل کر حقائق کی روشنی میں نہ آئیں اور سائنسی علوم کو اسی قابلیت اور عرق ریزی سے حاصل نہ کریں جس محنت و کاوش سے اہلِ مغرب نے ان میں دستگاہ بہم پہنچائی ہے۔ ہم سائنس اور صنعت کے میدان میں مغرب کے دوش بدوش چلنے کی کوشش کریں۔ ہمیں ہر دم یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیئے کہ اس دنیا کی زندگی عالمِ ارواح کی زندگی نہیں۔ یہ عالمِ اسباب اور عالمِ محسوس ہے جس کی ترکیب میں روح اور مادہ دونوں کا ہاتھ ہے لہذا اس میں کامیابی اور سربلندی کے لئے صرف روحانی طاقت ہی نہیں مادی قوت کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے اور مادہ کی تسخیر علم و فن کے بغیر ممکن نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے لہذا روحانی پاکیزگی کے ساتھ انہوں نے مادی وسائل اور علم و حکمت کی ثروت کو بھی جمع کیا اور اقوامِ عالم کے سردار اور رہنما بنے۔ دوبارہ ترقی کرنے اور طاقتور اقوام کی صف میں شامل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم علم و فن سے اپنا رشتہ محکم دوبارہ قائم کریں۔

(۵) تاریخ

اپنے ترقیاتی منصوبے میں اقبال نے پانچویں جگہ تاریخ سے آشنائی کو دی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ کی عام اہمیت سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ تاریخ علم و دانش کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ یہ بصیرت کا سرچشمہ اور روشنی طبع کا منبع ہے۔ خود قرآن نے اس پر خاصا زور دیا ہے اور بار بار ہمیں دعوت دی ہے کہ ہم اپنے سے پہلی قوموں کے حالات اور ان کے عروج و اسباب پر غور کریں اور ان سے سبق اور عبرت حاصل کریں۔ لیکن رموز بیخودی میں اقبال نے قومی زندگی کے لئے تاریخ کی اہمیت پر ایک اور زاویے سے روشنی ڈالی ہے مستقبل کی صحت مند تعمیر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعمیر کرنے والے اپنی تاریخ اپنے ماضی سے پوری طرح باخبر نہ ہوں اور اس کی صحت مند روایات کو تعمیر نو کے ڈھانچے میں اچھی طرح محفوظ نہ کرلیں۔ انفرادی نقطہ نظر سے تاریخ کی اہمیت زیادہ تر علمی اور نظری ہے لیکن قومی نقطہ نظر سے تاریخ بقا کی ضامن اور استحکام و تسلسل کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں قومی زندگی میں تاریخ کو وہی مقام حاصل ہے جو فرد کی زندگی میں اس کے حافظہ کا ہے۔ اگر حافظہ میں خلل واقع ہو جائے، وہ اپنا توازن کھو بیٹھے تو فرد اپنا دماغی توازن قائم نہیں رکھ سکتا وہ پگلا اور دیوانہ کہلاتا ہے۔ اس طرح جو قوم اپنی تاریخ سے ناآشنا ہوئی جس نے ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا جو اپنی روایات سے بیگانہ ہو گئی وہ بہ حیثیت قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی اسے عظمت اور سربلندی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاریخ سے محکم رشتہ، اپنی ماضی سے گہرا ربط تعمیر نو اور ترقی کے لئے بے حد ضروری ہے لہذا اقبال مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل اسلامی تاریخ سے پوری طرح آگاہ ہو اور اس کے نیک و بد سے واقف ہو کر اس کی بہترین روایات کو قائم رکھے اور ان لغزشوں سے باز رہے جن کے

باعث قوم انحطاط پذیر اور بے وقعت ہوئی۔ اقبال کے نزدیک تاریخ قصے کہانیوں کا مجموعہ نہیں، تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے سے فرد اپنے آپ کو جانتا پہچانتا ہے اور اس کے ربط سے اعلے مقاصد اور نصب العین حاصل کرتا ہے۔

چیست تاریخ اے زخود بیگانہ ۔۔۔ داستانے قصۂ افسانۂ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند ۔۔۔ آشنائے کار و مرد رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں ۔۔۔ جسم ملت را چو اعصاب است ایں

تاریخ سے تعلق فرد کو دوام اور قوم کو استحکام بخشتا ہے۔

ضبط کن تاریخ را پائندہ شو ۔۔۔ از نفسہائے رمیدہ زندہ شو
قوم روشن از سواد سرگذشت ۔۔۔ خودشناس آمد ز یادِ سرگذشت

(۶) کعبہ ــ مرکزِ محسوس

اس ترقیاتی منصوبے میں چھٹی چیز خانہ کعبہ سے وابستگی اور تعلق خاطر ہے۔ قومی اتحاد اور یک جہتی کے لئے وحدتِ فکر و عمل کے علاوہ ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ مادی رنگ میں بھی کسی ایک مقام سے وابستہ ہو تاکہ اس کی جمعیت قائم رہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔ روحانی طور پر ملتِ اسلامیہ کا اتحاد توحید و رسالت اور قرآنِ حکیم سے وابستہ ہے مادی صورت میں کعبہ ملت کا مرکزِ محسوس ہے۔

اقبال ملتِ اسلامیہ کے اتحاد و یک جہتی کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ ان کے نزدیک یہ اتحاد دو وجوہ سے ضروری تھا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اتحاد و یکسدلی کے بغیر اسلامی ممالک مغربی سامراج سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال خوب جانتے تھے کہ سامراجی قوتوں کا اصول "لڑاؤ اور حکومت کرو" ہے لہذا اس کا جواب اسی صورت میں دیا جاسکتا

کہ عالمِ اسلامی میں اتحاد کی بنیادیں مضبوط کی جائیں اور بڑے بڑے قومی مسئلوں اور منصوبوں میں ہر شخص ملت کا ساتھ دے اور اختلاف کی آواز کہیں سے بلند نہ ہو کیونکہ کمزور اور محکوم قوموں کے درمیان اختلاف ان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

لیکن اقبال کی نگاہ محض قومی اور ملی مصلحتوں پر ہی نہ تھی۔ وہ ملتِ اسلامیہ کا اتحاد انسانی نقطۂ نظر سے بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ مغرب میں اتحاد وطنیت اور قومیت کے نہایت محدود اصول پر قائم ہے جس کے باعث انسانی اور بین الاقوامی اتحاد کا راستہ مسدود ہو رہا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد میں انہیں بین الممالک اور بین الاقوامی اتحاد کی ایک نہایت مؤثر صورت نظر آتی تھی جو جغرافیائی قومیتوں کے شعور کو کم کرتا اور انسانی وحدت کے شعور کو تقویت بخشتا ہے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو مشورہ دیا ہے کہ وہ کعبہ کی مرکزی حیثیت کو قائم رکھیں اور ہر حال اور ہر زمانے میں اپنے آپ کو اس کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ اپنی اسلامی شاعری کے ابتدائی دور میں اقبال نے جب ترانۂ ملی لکھا تو کعبہ اور سرزمینِ کعبہ کے متعلق انہوں نے کہا تھا۔

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا

اس کے بعد اقبال نے ہر دور میں کعبہ کی مرکزی حیثیت پر زور دیا ہے۔ "رموز" میں انہوں نے بڑے زوردار اشعار میں بتایا ہے کہ قوم کا نظام مرکز چاہتا ہے اور ہماری قوم کے لئے کعبہ مرکز ہے اس کے گرد طواف کرنے کی بدولت ہم میں یک دلی اور ہم نفسی کی روح قائم ہے۔ حرم پاک ہمارے اتحاد اور جمعیت کا ضامن اور اس کی علامت ہے جب تک ملتِ اسلامیہ حرم سے وابستہ ہے وہ زندہ و پائندہ ہے۔

قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روزگارش را دوام از مرکزے
رازدار و رازِ ما بیت الحرم　　سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرم
ملتِ بیضا ز طوفش ہم نفس　　ہمچو صبح آفتاب اندر قفس
تو ز پیوندِ حریمے زندۂ!　　تا طوافِ او کنی پائندۂ!

آج ایک طرف پاکستان و افغانستان، دوسری طرف مصر و عراق اور اردن اور تیسری طرف ایران و عراق کے جو حالات ہیں ان کے پیشِ نظر بے حد ضروری ہے کہ ہم کعبہ کی مرکزی حیثیت کو زندہ رکھیں اور اس سے وابستہ رہیں۔ اگر یہ نکتہ جس پر اقبال نے عمر بھر زور دیا ہے ہم بھول گئے تو اندیشہ ہے کہ اسلامی ممالک کا آپس میں وہی حال نہ ہو جو انگلستان، فرانس اور جرمنی کا حال انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں رہا ہے۔ ہمسایہ اور ہم مذہب ہونے کے باوجود ان ملکوں کی باہمی رقابت نے دو بار ساری دنیا کو جنگ کے بھڑکتے شعلوں میں دھکیل دیا اور یہ آگ آج بھی، تھوڑا سا رنگ بدل کر، دلوں میں خوفناک طریق سے سلگ رہی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں امن قائم رکھنے اور عالمِ اسلامی میں اتحاد کی روح پھونکنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی ممالک کعبہ کو نہ صرف روحانی بلکہ سیاسی و معاشی مسائل حل کرنے کا بھی ایک مؤثر اور فعال مرکز بنائیں۔ مصر کے صدر ناصر نے چند سال پہلے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور عالمِ اسلام کے اتحاد و مفاہمت کے لئے ایک مرکزی مجلس حج کے موقع پر ترتیب دی تھی۔ مگر افسوس کہ بعد میں حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ وہ منصوبہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ آج وقت کا ایک نہایت اہم تقاضا ہے کہ کعبہ کو مرکز قرار دے کر عالمِ اسلامی کے اتحاد کے لئے ایک زبردست تحریک جاری کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسلامی ممالک ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان بٹ کر اپنی رہی سہی حیثیت بھی کھو

بیٹھیں گے اور جمال الدین افغانی اور اقبالؒ جیسے مفکرینِ اسلام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اقبال نے ایک خواب پاکستان کا دیکھا تھا جو ۱۹۴۷ء میں ایک حقیقت بن گیا۔ اس کے ساتھ اقبال ایک اور خواب بھی دیکھا کرتے تھے۔ اس کا تعلق عالمِ اسلامی کے اتحاد اور اغیار کے مقابلے میں ان کی جمعیت کا تھا۔ پاکستان کو اپنا قائداعظم مل گیا۔ اسلام کی روح اب تک اپنے قائد کی راہ دیکھ رہی ہے جو شخص اس خواب کو سچا کر دکھلائے گا، وہ عہدِ حاضر کی اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا انسان مانا جائے گا۔

کچھ عجب نہیں جس سرزمین نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ جیسے دردمندانِ اسلام پیدا کئے عالمِ اسلام کا یہ نیا قائد بھی اسی سرزمین سے پیدا ہو۔ خود نظریۂ پاکستان کا منطقی تقاضا بھی یہی ہے۔

باب ۱۵

مسلمان عورت

کوئی معاشری نظام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں عورت کی حیثیت معین نہ کی جائے۔ عورت کے حقوق کیا ہیں؟ اس کا فرائض کا دائرہ کہاں تک وسیع یا محدود ہے، وہ سوسائٹی میں کس قدر و منزلت کی مستحق ہے؟ اور یہ قدر و منزلت اس کے کن اوصاف کی بدولت اس کو حاصل ہو گی؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالات ہر نظام تمدن میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ "رموز بیخودی" میں جہاں اقبال نے اسلامی اجتماعیت کا فلسفہ پیش کیا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے معاشری نظام کی توضیح کی ہے۔ وہ عورت کے مسئلے کو کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے۔ چنانچہ اس مثنوی کے ۲۳ویں، ۲۴ویں اور ۲۵ویں باب میں انہوں نے مسلمان عورت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

امومت

مرد کی طرح عورت کی بھی سوسائٹی میں مختلف حیثیتیں ہیں وہ بیوی ہے، ماں ہے اور بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کی کچھ حیثیتیں ممکن ہیں۔ مثلاً وہ مددگار یا ملازمہ بھی ہو سکتی ہے اقبال کی نظر میں عورت کی سب سے اہم اور بنیادی حیثیت ماں کی ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا صحیح احساس ہو گا کہ نسلِ انسانی کی بقا کا انحصار

سب سے زیادہ ماممتا کے جذبے پر ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت جو دکھ اور ذمہ داریاں اٹھاتی ہے، زندگی کے ارتقاء کا منصوبہ اسی کے سہارے پروان چڑھ رہا ہے۔ انسانوں کی اکثریت ہمیشہ سے کم نظر اور سطح بین رہی ہے۔ انہوں نے عورت کے ظاہری حسن و جمال کی ہر دور میں قدر کی ہے لیکن اس کی فطرت کی گہرائیوں میں جو سوز و تپش اور عفت و ایثار کے جوہر مخفی ہیں اس کی منزلت نہیں پہچانی۔ اکثر تہذیبوں نے جہاں عورت کے کچھ حقوق تسلیم کئے۔ وہاں اس پر مختلف قسم کے ستم بھی روا رکھے۔ قدیم ہندو تہذیب میں عورت کو دیوی بھی سمجھا جاتا رہا اور ایک ایسا ناپاک وجود بھی جو گناہ کی طرف زبردست ترغیب کا حکم رکھتا ہو۔ مصر و یونان کے دورِ تہذیب میں اونچے طبقے کی عورتوں کو کچھ آزادیاں بھی تھیں مگر قانون اور معاشرت کی نظر میں ان کو ایک فرد کی حیثیت سے کبھی تسلیم نہ کیا گیا۔ ان کو وراثت کا حقدار اور عدالت میں شہادت کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ باپ اور خاوند سے الگ ان کی انفرادیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ عورت تھی لیکن مرد کا سایہ۔ اس طرح قبل از اسلام عرب کے جاہلانہ تمدن میں محبوبہ کے گیت گائے جاتے تھے مگر عملاً وہ مرد کی جائداد تھی یا پھر ایک ایسی ہستی جس کا وجود اس کے باپ کے لئے باعثِ عار تھا۔ جدید مغربی تہذیب نے بلاشبہ عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کی نئی وضع اختیار کی، اس کو کتنی ہی پابندیوں سے آزاد کیا اور کتنے ہی مظالم سے اس کو نجات دلائی۔ اس کے باوجود اس نے عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ عورت پر نئی تہذیب کا ستم ایک انوکھا ستم ہے۔ اس نے عورت کو اس کے حقیقی جوہر سے محروم کرنے کی سعی کی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر سے عورت کے اندر ماں بننے کی آرزو مٹ رہی ہے۔ اقبال نے فرنگی تہذیب پر جو تنقید کی ہے اس میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) میں ایک جگہ کہتے ہیں

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہندو یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

اس کتاب میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت

تہذیب مغرب کے اس عیب کو اب خود مغرب کے مفکرین تسلیم کرتے ہیں چنانچہ امریکہ کا ایک ممتاز سائنس دان اور حکیم ALEXIS CARREL جسے طب میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے اپنی مشہور و مقبول کتاب "انسانِ نامعلوم" میں جدید تہذیب کے اس رجحان کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جن عورتوں کے بچہ نہیں ہوتا ان کا ذہن حقیقی طور پر متوازن نہیں ہوتا ایسی عورتیں دوسری عورتوں کی نسبت بہت جلد پریشان اور بدحواس NERVOUS ہو جاتی ہیں۔ دراصل عورت کی زندگی میں تولیدگی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو اب تک تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہ عمل اس کی شخصیت و کردار کی نشوونما کے لئے قطعی ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہیں۔ لہٰذا عورتوں کو امومت (ماں بننے) کے خلاف ترغیب دینا پورے درجہ کی حماقت ہے۔

نوجوان لڑکیوں کو ویسی ہی ذہنی اور جسمانی تربیت اور ویسی ہی آرزوئیں نہیں ملنی چاہئیں جیسی کہ لڑکوں کو دی جاتی ہیں۔ تعلیم دینے والوں کا فرض ہے کہ مرد اور عورت کے ذہنی اور بدنی کوائف میں جو فرق ہے اس کو ملحوظ رکھیں اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھیں۔ دونوں جنسوں کے درمیان کبھی نہ مٹنے والے اختلافات ہیں اور یہ نہایت ضروری ہے کہ مہذب دنیا کی تعمیرِ نو میں ان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔[1]

یہی مصنف اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھتا ہے۔

"نسل کی بقا کے لئے صحت مند تولیدگی از بس ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں جوں جوں تہذیب بڑھ رہی ہے تولیدگی کا مذاق اور معیار گرتا جا رہا ہے۔ عورتیں شراب اور تمباکو نوشی سے اپنی صحت کو برباد کر رہی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دبلا پتلا دکھانے کے شوق میں غذا سے پرہیز کی ایک خطرناک راہ پر پڑتی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ بچہ پیدا کرنے سے انکار کر دیتی ہیں یہ عیب ان میں موجودہ تعلیم کی بدولت اور تحریکِ نسواں کے پھیل جانے اور خود غرضی کا رجحان بڑھ جانے سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی ذمہ داری معاشی حالات، اعصابی عدم توازن، ازدواجی زندگی کے عدم استحکام اور اس اندیشہ پر بھی ہے کہ بچے کہیں کمزور یا بدچلن پیدا نہ ہوں۔ قدیم خاندانوں کی عورتیں جن کے بچے اچھے ہو سکتے ہیں اور جو ان کی عمدہ غور و پرداخت کے اہل ہیں قریب قریب

---

[1] صفحہ ۹۲

بانجھ ہو چکی ہیں ان حالات میں جب تک ہمارے انداز فکر اور طرزِ معاشرت میں بنیادی انقلاب رونما نہیں ہوتا اور ہماری نظروں کے سامنے ایک نصب العین نہیں آجاتا پیدائش کی شرح بہتر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔[۱]

رموز کا ۲۲ واں باب اسی موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی بقا امومت کی بدولت ہے اور امومت کی حفاظت اور احترام عین اسلام ہے۔ یہاں ایک طرف تو اقبال نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ ایک کامیاب اور اعلیٰ درجہ کی ماں ثابت ہو اور دوسری طرف یورپی تہذیب کے اس رجحان کی سخت مذمت کی ہے جس کے زیرِ اثر عورت نازک اندام، روشن دماغ اور شوخ چشم بننے کو اپنا منتہیٰ سمجھتی ہے اور ماں بننے سے گریزاں ہے۔

قرآن حکیم نے مرد اور عورت کے باہمی ازدواجی تعلقات کی حکمت، گہرائی اور جامعیت کو لباس کے بلیغ استعارے میں بیان فرمایا ہے۔ عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا لباس ہیں۔[۲] لباس زینت بھی ہے، عریانی کے لئے پوشش بھی اور موسم کے مضر اثرات کے خلاف تحفظ بھی۔ اقبال نے اپنی گفتگو اسی آیت کے حوالے سے شروع کی ہے۔ عورت مرد کی عریانی کا پردہ اور اس کے جذباتِ عشق کا پیراہن ہے۔ سچائی کی لگن جو انسانی زندگی کا سرچشمہ ہے مرد کے اندر عورت ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے اور یہ نرم و نازک جذبات

---

[۱] ایضاً، صفحہ ۲۹۹-۳۰۰

[۲] هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو)

اسی کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ اسی طرح رسولِ کریمؐ کی مشہور حدیث ہے کہ جنّت ماں کے قدموں میں ہے۔ ایک اور حدیث میں (جو ہم نے گذشتہ باب میں مطالعہ کی ہے) عورتوں کو اس دنیا کی تین بہترین نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اقبال نے ان احادیث اور مذکورہ بالا آیت قرآنی سے عورت کا شرف و تقدس ثابت کر کے اس کے جذبۂ امومت کو دنیا کے لئے باعثِ رحمت قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں دو نکتے انہوں نے اور بیان کئے ہیں۔ عربی زبان میں ماں کو "اُمّ" کہتے ہیں اور قوم کو "اُمّت"۔ علم الحیات کی رو سے قومیں (افراد) ماؤں سے پیدا ہوتی ہی ہیں۔ اقبال نے یہ لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ علم اللسان کی رُو سے بھی امّت کا مصدر اُمّ ہے۔ دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ پیغمبر انسانوں کی سیرت اور اخلاق کو بنانے سنوارنے کا کام انجام دیتے ہیں اور ماؤں کا منصب بھی یہی ہے۔ وہ بھی اولاد کی سیرت بناتی اور سنوارتی ہیں لہٰذا ماؤں کے فریضہ اور پیغمبر کے فریضہ میں ایک قدر مشترک ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ماں کی شفقت پیغمبر کی شفقت ہے[1]۔ ان دلائل سے ماؤں کی عظمت و فضیلت کا نقش دلوں پر بٹھانے کے بعد اقبال نے دو نہایت زوردار شعر اس موضوع پر کہے ہیں۔ زندگی کی یہ گرم رفتاری، یہ رونق، یہ چہل پہل امومت کی بدولت ہے۔ اس کی بدولت فطرت کے حقائق منکشف ہو رہے ہیں۔ انسانوں کی ہر نئی نسل پہلی نسل کے مقابلے میں علوم و فنون میں ترقی کر رہی ہے اور یہ ترقی ظاہر ہے کہ اسی وجہ سے ہے کہ مائیں نئی نسل کو جنم دے کر ان کو حقائق و معارف معلوم کرنے کے اہل بنا رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کے

---

[1] شفقتِ او شفقتِ پیغمبر است　　　سیرتِ اقوام را صورت گر است

دریا کا سارا جوش و خروش، اس کی تندی اور تیزی، اس کا بہاؤ اور روانی اور اس کے موج و گرداب سب امومت کا مرہونِ منت ہے۔ مائیں نہ ہوں، اگر ان کی مامتا نہ ہو تو زندگی کا بہتا دریا تھم جائے، اس کا بہاؤ رک جائے۔

از امومت گرم رفتارِ حیات	از امومت کشفِ اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تابِ جوئے ما	موج و گرداب و حبابِ جوئے ما

باب کے آخر میں اقبال نے اپنے خیال کو ایک اور اسلوب سے قاری کے دل میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ کہتے ہیں:۔ وہ دہقان زادی جو جاہل، پست قامت، بدصورت کم زبان اور سادہ سی ہے مگر اس کا دل اپنی اولاد میں لگا ہوا ہے اور وہ ملت میں ایک غیرت مند اور حق پرست مسلمان کا اضافہ کرتی ہے اس تعلیم یافتہ عورت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کی تعلیم نے اس کو خالی گود رہنا سکھایا ہے اور جس کے اثر سے اس کی نگاہ حیا سے اور اس کا دل فکر و خیال کی پاکیزگی سے محروم ہو گیا ہے یہ خاتون جس کا دماغ مغرب کی ضیا سے روشن ہے بظاہر عورت دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں وہ عورت نہیں ہے۔

فکر او از تابِ مغرب روشن است	ظاہرش زن، باطنِ او نازن است

اس کی بے حجاب آنکھ اور فتنہ انگیز چلن نے ملت کی تعمیر میں رخنے ڈال دیئے ہیں اس کے علم نے مامتا کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہے گویا اس کی شام کے افق پر کوئی ستارہ نہیں چمکا۔ اگر یہ کلی ہمارے گلستاں میں نہ ہوتی تو اچھا ہوتا اور اگر اس کے وجود کا داغ ہمارے دامن سے دھل جائے تو بہتر ہوگا۔

علم او بارِ امومت بر نتافت	بر سرِ شامش یکے اختر نتافت
ایں گل از بستانِ ما نارُستہ بہ	داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

حضرت فاطمۃ الزہراؓ

اگلے باب میں اقبال نے حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی سیرت کے چند پہلو بیان کرکے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان عورتوں کو سیدۃ النساء کے اسوۂ کاملہ سے سبق سیکھنا چاہیئے اور ان کے اخلاق و کردار کی پیروی کرنی چاہیئے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے حضرت فاطمہؓ کی زندگی پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کی یہ صاحبزادی حضرت علیؓ کی رفیقۂ حیات اور حضرات امام حسنؓ اور امام حسینؓ کی والدہ ماجدہ ایک مثالی بیٹی، ایک مثالی بیوی اور ایک مثالی ماں تھیں۔ ان کی سلیقہ شعاری، دینداری اور عبادت گزاری کا دور دور تک چرچا تھا۔ تلاوتِ قرآن حکیم کے شوق کا یہ عالم تھا کہ گھر میں چکی پیستے وقت ہاتھ گھر کے دھندے میں لگے رہتے اور زبان و دل کتاب اللہ کی قرأت میں۔ سخاوت اور رحمدلی کا جذبہ اس قدر تھا کہ ایک بار کسی محتاج کی امداد کی خاطر اپنی چادر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔ حضرت علیؓ کی زندگی بڑی سادہ اور درویشانہ تھی۔ بعض اوقات گھر میں فاقہ کی نوبت آجاتی۔ حضرت فاطمہؓ نے اس تنگی ترشی کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اور بیوی کی حیثیت سے رفاقت اور فرمانبرداری کا ایسا حق ادا کیا کہ حضرت علیؓ ان کے اخلاق کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ ان کے ایثار کے دل و جان سے قدردان تھے اور ان کی رائے کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ماں کی حیثیت سے حضرت فاطمہؓ نے جو کارنامہ انجام دیا وہ تاریخِ عالم میں اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے واقعۂ کربلا کے موقع پر جس عظیم کردار کا ثبوت دیا ظاہر ہے کہ اس میں اس تربیت کو بڑا دخل تھا جو حضرت امام کو اپنی والدہ سے حاصل ہوئی تھی۔ اقبال نے ان سب واقعات کو مختصراً بیان کرکے جدید عہد کی مسلمان عورتوں کو اسوۂ فاطمۃ الزہراؓ کی طرف متوجہ کیا اور آخر میں وفورِ جذبات و عقیدت میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر اسلام میں قبر پر جھکنا یا

سجدۂ تعظیم بجا لانا ممنوع نہ ہوتا تو میں حضرت فاطمۃ الزہرؓا کے مزار کا طواف کرتا اور ان کی خدمت میں اپنے سجدوں کا نذرانہ پیش کرتا۔

مسلم خواتین سے خطاب

۲۵ویں باب میں اقبال نے مسلمان خواتین کو براہِ راست مخاطب کر کے انہیں نئی تہذیب کے زہریلے اثرات سے خبردار کیا ہے کہتے ہیں اے مسلمان عورت! تو ہماری عزت و ناموس کی چادر ہے۔ تیری پاک طینت ہمارے لئے باعث رحمت ہے۔ تیری بدولت ہی ہمارا دین اور ہماری ملت کی بنیادیں محکم ہیں۔ ہمارے بچے تیری آغوش میں لَا اِلٰہ کا سبق سیکھتے ہیں اور تیری تربیت ہی ان کے فکر و کردار کو دین کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ دراصل قوم میں اسلام کی محبت اور دین پر فدا ہو جانے کا جذبہ تیرے ہی جذبۂ دین داری اور عفت سے پیدا ہوتا ہے۔ تیری ذمہ داریاں نہایت عظیم ہیں۔ تو دین کی محافظ ہے لہٰذا تیرے لئے یہ جاننا ازبس ضروری ہے کہ دورِ حاضر کی تہذیب انسانوں کے کردار و اخلاق پر کس قدر زہریلے اثرات ڈال رہی ہے۔ نئی تہذیب انسانوں کو دین و مذہب سے بیگانہ اور خدا و رسول سے منحرف کر رہی ہے۔ یہ حق پرستی کے لئے سم قاتل ہے۔ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ بے باکی اور بے حیائی کا درس دیتی ہے اور جب آنکھ میں شرم و حجاب باقی نہیں رہتا تو دل میں پاکیزہ خیالات پیدا نہیں ہوتے[1] نئی تہذیب

---

[1] اس خیال کو اردو میں یوں بیان کیا ہے

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو (بالِ جبریل)

کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی آنکھ میں ایسا جادو ہے کہ جس کو یہ اپنے دام میں گرفتار کرتی ہے اس کو اپنی اسیری اور گرفتاری کا احساس تک ہونے نہیں دیتی۔ اس کے طلسم میں گرفتار ہونے والا اپنے آپ کو آزاد اور خوش نصیب خیال کرتا ہے۔ لہٰذا اے مسلمان عورت! تو اس دور کی مکاری اور فریب کاری سے دھوکا نہ کھانا۔ اس کی چالوں میں نہ آنا، اس کے اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا اور اپنے بچوں کی تربیت ان اصولوں کے مطابق کرنا جو ہمارے آباؤ اجداد کو عزیز تھے۔ یورپ کی نئی عورت کی پیروی کرنے کی بجائے تو حضرت فاطمہؓ کے نقش قدم پر چل تاکہ تیری شاخ سے بھی حسین جیسے پھول کھلیں اور ہمارے گلزار میں بہار آجائے۔

باب ۱۶

سورۂ اخلاص کی تفسیر

قرآن حکیم کی ۱۱۲ ویں سورت سورۂ اخلاص ہے یہ مکی دور کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ ہم اسے قرآن حکیم کی مختصر ترین سورہ قرار دے سکتے ہیں۔ چار چھوٹی چھوٹی آیات میں توحید کی حقیقت اور دین کی اصل اس حسن اختصار اور بلاغت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ عقل انسانی کو حیرت ہوتی ہے۔ رسول کریم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کہہ دو اللہ ایک ہے اَللّٰهُ الصَّمَدُ اللہ بے نیاز ہے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ نہ اس نے کسی کو جنم دیا ہے اور نہ اسے کسی نے جنم دیا ہے۔ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔ اور اس کے برابر کوئی نہیں ہے۔ مثنوی "رموز بے خودی" کے آخر میں اقبال نے اس سورہ کی تفسیر کچھ ایسے حکیمانہ انداز میں پیش کی ہے کہ ان کے فلسفۂ خودی کی روح اس میں سمٹ آئی ہے۔

باب کے آغاز میں اقبال نے ایک خواب بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ ایک رات میں نے خواب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ان کی خدمت میں عرض کی: آپ نے رسولِ کریمؐ کے بعد ہماری ملت کو ایسے مشکل وقت میں مضبوط بنایا جب چاروں طرف فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ آج بھی عالمِ اسلام ایسے ہی خلفشار سے

دوچار ہے۔ کیا آپ ہمارے دکھوں کا کوئی علاج تجویز فرمائیں گے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: تم مسلمان کب تک خود غرضیوں اور ہوس پرستیوں میں مبتلا رہوگے؟ تم سورۂ اخلاص سے کیوں روشنی اور رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔

گفت تا کے در ہوس گردی اسیر　　　آب و تاب از سورۂ اخلاص گیر

اس تمہید کے بعد اقبال اس سورہ کی ایک ایک آیت کی تفسیر (حضرت ابوبکرؓ کی زبانی) بیان کرتے ہیں۔

ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ

اللہ تعالیٰ کی صفات مسلمان کے اخلاق کے لئے نصب العین کی حیثیت رکھتی ہیں مشہور حدیث ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ یعنی اپنے اخلاق کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے مطابق ڈھالو۔ سورۂ اخلاص کی پہلی آیت (مطلب:۔ اللہ ایک ہے) ملّتِ اسلامیہ کے لئے اتحادِ فکر و عمل کا ایک زبردست پیغام ہے۔ جب مسلمان متعدد خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا پر ایمان لائے ہیں تو پھر ان کے اندر بھی وحدت کی شان نمایاں ہونی چاہیئے جس طرح توحید دوئی کو گوارا نہیں کرتی، توحید پر ایمان فرقہ آرائی اور گروہ بندی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ توحید پر ایمان اور گروہ بندی دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ مسلمان اگر اپنے آپ کو ترک یا افغان سمجھنے لگے تو پھر زبان سے کلمۂ توحید پڑھنے سے کیا حاصل ہوگا؟ "اللہ ایک ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ماننے والے بھی ایک ہوں۔ ملّتِ بیضا کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مختلف گروہوں، فرقوں، ذاتوں اور جماعتوں میں بٹ گئی اور اس میں اتحاد کا جذبہ اور عمل کی وحدت باقی نہ رہی۔ یہ انتشار یہ تفرقہ اندازی

هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ کی سراسر خلاف ورزی اور اس کی روح سے بغاوت ہے حضرت ابوبکرؓ شاعرؔ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں تم نے ایک ملت کو سو ملتوں میں بانٹ کر اپنے قلعے پر خود شب خون مارا ہے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی چلائی ہے۔

صد ملل از ملتے انگیختی　　　بر حصارِ خود شبیخوں ریختی

اس کا واحد علاج یہی ہے کہ ایک ہو جاؤ اور ایک ہو کر خدا کے ایک ہونے کی دلیل مہیا کرو۔ تمہاری وحدت خدا کی وحدانیت کا زندہ ثبوت ہوگی۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ

خودداری اور غیرت مندی اقبال کا محبوب ترین موضوع ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غیرت اور بے نیازی میں چولی دامن کا ساتھ ہے جب تک کسی شخص کے اندر ایک گونہ بے نیازی نہ ہوگی وہ اپنی خودداری اور حمیت کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور جب تک کوئی خوددار اور غیرت مند نہ ہوگا اس میں بے نیازی نہیں آسکتی۔ ان دو صفات کا آپس میں بہرصورت گہرا تعلق ہے۔

اللہ بے نیاز ہے، کی تعبیر میں اقبال نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے نیازی کی ضرورت واضح کی ہے اور اسی بات پر زور دیا ہے کہ ہم اس اہم خصوصیت کو جو ہمارے آباؤ اجداد کا امتیازی وصف تھا اپنے اندر پھر سے پیدا کریں۔

اقبال کو اس بات کا بڑا رنج ہے کہ مسلمان خودداری اور غیرت مندی کا جوہر کھو چکے ہیں وہ غیر قوم کے افکار و عقائد کو بغیر سوچے سمجھے اپنا رہے ہیں۔ وہ دوسروں کی زبان، دوسروں کی طرزِ معاشرت اور دوسروں کا نظامِ حکومت حتیٰ کہ دوسروں کا لباس تک اختیار کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اس سے ان کے اندر جذبۂ حمیت کمزور پڑ گیا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ جو قوم اَللّٰہُ الصَّمَدُ کا ورد کرتی ہے وہ خدا کی ذات اور اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کی بجائے دوسروں

کی اعانت و امداد کی محتاج ہو اور اپنی ضروریات کے لئے غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے!!
ان کے نزدیک "اللہ بے نیاز ہے" کا لازمی اثر یہ ہونا چاہیئے کہ مسلمان بھی بے نیاز ہو۔ ایمان کا
پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی دوسری طاقت کو اپنا سہارا نہ بنائے اور غیروں کی امداد
پر تکیہ نہ کرے سچے مسلمان کی غیرت شہنشاہوں کے سامنے بھی نہیں جھکتی۔ افلاس ہو یا تونگری ہر حال
میں اس کی گردن بلند رہتی ہے وہ اللہ کے سوا کسی تو سے اپنی امیدیں وابستہ نہیں کرتا۔ کسی کو اپنا کارساز
نہیں سمجھتا کسی کو اپنی زندگی اور موت عزت اور ذلت کا حاکم نہیں گردانتا۔ اس کا ایمان ہے کہ رنج و
راحت، ذلت و آبرو سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

یہاں اقبال امام مالکؒ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ امام مالکؒ بن انسؓ (سنہ ۹۳ھ
تا سنہ ۱۷۹ھ) دوسری صدی ہجری کے نہایت بلند پایہ آئمہ دین میں سے۔ ان کی ذات میں دو باتیں
خصوصیت سے نمایاں تھیں۔ پارسائی اور احادیثِ رسول سے محبت۔ چنانچہ ان کی کتاب "موطا"
حدیث کا پہلا مجموعہ ہے اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مالکؒ مدینہ میں پیدا ہوئے
وہیں تعلیم پائی اور وہیں تا دمِ آخر درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ایک بار خلیفہ وقت
ہارون الرشید نے ان کو کہلا بھیجا کہ آپ مدینہ چھوڑ کر بغداد چلے آئیں۔ بغداد چونکہ دارالخلافت ہے
اس لئے یہاں آپ کے علم و فضل کی زیادہ قدر ہوگی نیز میں بھی آپ کے درس سے استفادہ کرسکونگا۔
امام مالکؒ کی آزاد اور بے نیاز طبیعت کے لئے یہ دعوت قابلِ قبول نہ تھی۔ جواب میں انہوں
نے لکھا، جو فریضہ جس مقام پر رہ کر انجام دے رہا ہوں میرا دل اس سے مطمئن ہے۔ رسولِ کریمؐ
کی محبت مجھے مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ رہا آپ کے استفادہ کا سوال تو آپ جب
چاہیں یہاں آکر میرے حلقۂ درس میں شریک ہوسکتے ہیں۔

اس واقعہ کے بیان سے اقبال کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ سچا مسلمان دولت و اقتدار سے

مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں شہرت اور ناموری کی ہوس نہیں ہوتی۔ دنیا کا کوئی لالچ کوئی تحریص کوئی دھمکی اس کو اس کے مقام اور موقف سے ہٹا نہیں سکتی۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل اور بے نیاز ہے۔

لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ

سورۂ اخلاص کی تیسری آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نسل و نسب کے تعلقات سے پاک ہے وہ کسی کا بیٹا ہے نہ کسی کا باپ۔ اس آیت کی اجتماعی معنویت کو اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ مسلمان بھی رنگ، نسب اور وطن و نسل کی قیود سے آزاد ہے۔ وہ یقیناً کسی کا بیٹا اور اکثر صورتوں میں کسی کا باپ ہوگا لیکن اسلام میں باپ اور بیٹے کا تعلق اپنے حدود رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد باوجود سمجھانے بجھانے کے جب بت پرستی سے باز نہ آئے تو بیٹے کو باپ سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ حضرت نوحؑ کا بیٹا ظالموں اور مشرکوں سے جا ملا اور اپنی حرکات ناز یبا سے تائب نہ ہوا تو باپ نے اس سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔ رسول کریمؐ کے ہم وطنوں نے جب دعوتِ توحید کی مخالفت کی تو آپ نے پردیس کو دیس پر ترجیح دے کر مولد کو خیرباد کہہ دیا اور اسکے مقابلے میں اس دیار (مدینہ منورہ) کو اپنی سکونت اور محبت کا زیادہ حقدار سمجھا جس نے اسلام کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی نظر میں اصل رشتہ رشتۂ توحید ہے۔ نسب اور وطن کے رشتے اس کے نزدیک کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔

اقبال نے لم یلد ولم یولد کی تفسیر میں دو باتیں بیان کی ہیں۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ سے کسی نے ان کا شجرۂ نسب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا "سلمان ابن اسلام"۔ اس ذرا سے جملے میں اسلام اور اسلامی قومیت کی روح سمٹ آئی ہے۔ حضرت سلمانؓ نے اپنے آپ کو ایرانی بتانے اور اپنے باپ دادا کا نام لینے کی بجائے کہا تو یہ کہا کہ "میں سلمان اسلام کا بیٹا ہوں"، اور اس کو اپنے حسب نسب کے لئے کافی سمجھا۔ اقبال نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ماں باپ اور چچا ماموں پر فخر کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ

خونی رشتے کی اسلام میں بس واجبی سی اہمیت ہے۔

اس ضمن میں اقبال نے جو دوسری بات کہی ہے اسے یقیناً ان کے عمیق ترین افکار میں جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ اچھوتی دلیل نہایت وزنی اور بے حد متاثر کرنے والی ہے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ذرا شہد کی ماہیت پر غور کرو۔ شہد کیا ہے؟ مختلف پھولوں سے نکلا ہوا رس۔ اس میں لالہ و گل کے قطرے بھی شامل ہیں اور نرگس و نسترن کے بھی۔ مگر یہ قطرے جب چھتے میں پہنچ جاتے ہیں تو پھولوں کے اختلاف کا اثر ان سے یکسر زائل ہو جاتا ہے۔ مختلف پھولوں سے آئے ہوئے قطرے ایک نئی حقیقت، ایک نئی وحدت میں ڈھل جاتے ہیں کہ ان سب کا مزہ، رنگت، کیفیت بالکل ایک ہے، ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ امتیاز۔ یہ قطرے شہد بن کر اپنی ابتدائی نسبتوں سے قطعی بالاتر ہو چکے ہیں۔ شہد فقط شہد ہے۔ اس کی کوئی بوند نہ قطرۂ گل ہے اور نہ قطرۂ نرگس۔ اسی طرح مختلف ملکوں، رنگوں، نسلوں اور نسبوں کے لوگ جب اسلام کے حلقے میں داخل ہوتے ہیں جب دینِ ابراہیمی اختیار کرتے ہیں تو وہ تمام مادی اور دنیاوی علائق سے بالاتر ہو کر ایک نئی نسبت، ایک نئی حقیقت، ایک نئی وحدت میں سموئے جاتے ہیں، ان میں گورے اور کالے، ہندی اور چینی مصری اور افغانی کی تمیز باقی نہیں رہتی جس طرح ان کا خدا نسب اور خون کے رشتوں سے پاک ہے وہ لم یلد ولم یولد ہے اسی طرح مسلمان بھی رنگ و نسل کے امتیازات سے بالاتر ہیں۔

اس حصۂ تفسیر میں دو شعر خصوصیت سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ ایک وہ ہے جس میں انہوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ اگر انہوں نے نسب اور وطن کو جزوِ قوم بنا لیا تو ان کی جمعیت بکھر جائے گی اور عالمگیر اخوت کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے اسے سخت نقصان پہنچے گا۔

گر نسب را جزوِ ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اخوت کردۂ

اس خیال کو انہوں نے چند سال بعد خضرِ راہ (۱۹۲۲ء) میں یوں بیان کیا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

دوسرا شعر جس پر یہ حصہ تفسیر ختم ہوتا ہے بڑا معنی دار ہے۔ اس میں کہتے ہیں جس شخص نے اقلیم (وطن) یا جد (نسب) کا اپنے آپ کو پابند بنالیا یعنی جس نے مادی علائق کو اپنے دل میں جگہ دی وہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُولَدْ کی حقیقت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ اس آیۂ شریفہ کے معنی اس شخص کی سمجھ میں آئیں گے جو اپنے آپ کو وطن اور خون کے رشتوں سے بلند کرے گا۔

ہر کہ پا در بندِ اقلیم و جد است
بے خبر از لم یلد ولم یولد است

وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ

سورۂ اخلاص کی آخری آیتِ شریفہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ بے مثل و بے ہمتا ہے۔ کائنات میں کوئی ہستی اس کی برابری کا دعوےٰ نہیں کر سکتی۔ کوئی ذات اس کی مدِ مقابل نہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے اس آیت کی معنویت یہ ہے کہ جس طرح ہمارا خدا اپنا مثیل نہیں رکھتا اس لئے ہم کو بھی بے مثل اور منفرد ہونا چاہیئے۔ ملتِ اسلامیہ اپنے افراد کے عظیم کردار اور اعلےٰ مقاصد کی بنا پر دنیا میں ممتاز ہے۔ یہاں اقبال نے مسلمان کے کردار کی ایسی تصویر کھینچی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کوئی سورۂ اخلاص کو اپنی زندگی میں جگہ دے گا

اس کی شخصیت بہترین اوصاف کی حامل بن جائے گی اور اس کی ذات میں اخلاقِ حسنہ کا ایک نادر امتزاج ظہور میں آئے گا۔

اقبال نے اپنے کلامِ نظم و نثر میں کئی مقامات پر مردِ مومن، سچے مسلمان اور مثالی انسان کے اوصاف و صفات کی تصویر کشی کی ہے۔ سورۂ اخلاص کی تفسیر کا زیرِ نظر حصہ بھی انہی مقامات میں سے ہے۔ قرآن حکیم میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "اے ایمان والو! مشکلات سے گھبراؤ نہیں اور نہ آزردگیِ خاطر کا شکار ہو۔ اگر تمہارے دلوں میں ایمان راسخ ہو گیا تو تم یقیناً فائق و کامران ہو کر رہو گے"[1] اقبال نے اپنا بیان اسی آیت سے شروع کیا ہے۔ مومن ہر بلند و بالا سے بالاتر ہے کیونکہ حمیت و غیرت میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ وہ وَلَا تَحْزَنُوْا کا خرقہ زیبِ تن کئے ہے اور اس کے سر پر اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا تاج دھرا ہے۔ وہ خدا کا ایک سپاہی ہے جو دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ حق و صداقت کی حمایت کرے اور باطل کی قوتوں سے نبرد آزما رہے وہ نیکی کا محافظ اور بدی کا دشمن ہے۔ اس کی تگ و دو کا مقصود یہ ہے کہ زندگی اپنے صحیح مقام سے آشنا ہو اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حیات حق و خیر کی راہ میں آگے بڑھے۔ اس کی ذات میں انصاف، احسان، بخشش اور درگزر کا مادہ درجۂ کمال کو پہنچا ہوتا ہے۔ اس کے مزاج کی درشتی بھی عالمِ انسانی کے لئے رحمت کا باعث ہوتی ہے۔ اس کے اندر جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ دوستوں کی محفل میں اس کی گفتگو دلنواز اور دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی تلوار زہرہ گداز ہوتی ہے۔ جب وہ گلستاں میں جاتا ہے تو بلبلیں اس کی دوست اور ہم صفیر ہوتی ہیں مگر جب بیابان میں پہنچتا ہے تو عقاب و شاہیں کا شکار کرتا ہے۔ قرآن حکیم

---

[1] وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ٥ (۳:۱۳۹)

میں ایک مقام پر مسلمانوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ آپس میں رحیم و کریم ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی شفقت اور مروت کا سلوک کرتے ہیں مگر کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت گیر اور پر ہیبت ہیں۔ اقبال نے غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر اپنے کلام میں کئی مقامات پر مسلمان کی نرمی و سختی، لطافت و تلخی اور جلال و جمال کا ذکر کیا ہے۔ یہاں صرف دو شعر درج کئے جاتے ہیں۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مختصر یہ کہ اقبال کی نظر میں سورۂ اخلاص جہاں ایک طرف باری تعالیٰ کی ذات و صفات کا آئینہ ہے وہاں مسلمانوں نے انفرادی اور اجتماعی کردار کے لئے انتہائی نصب العین بھی ہے خدا کی وحدانیت سے مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کا سبق ملتا ہے۔ اس کی بے نیازی ان کے اندر بھی بے نیازی کی شان پیدا کرتی ہے۔ خدا تعالےٰ نسب کی آلائشوں سے پاک ہے تو مسلمان بھی رنگ و نسل اور وطن و زبان کی نسبتوں کا پابند نہیں۔ اس کی ہمدردیوں کا دائرہ تمام نسلِ انسانی کو اور اس کی خیر طلبیوں کا حلقہ پورے کرۂ ارضی کو محیط ہے۔ وہ عقائد و اعمال دونوں کے لحاظ سے آفاقی اور کائناتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح اس کا خدا یکتا و یگانہ ہے مسلمان کا کردار بھی بے مثل ہے۔ سچا مسلمان حسنِ نظر اور حسنِ عمل کا پیکرِ کمال ہے۔